قومی زبان

بیادِ علامہ اقبال

نومبر ۲۰۰۸ء

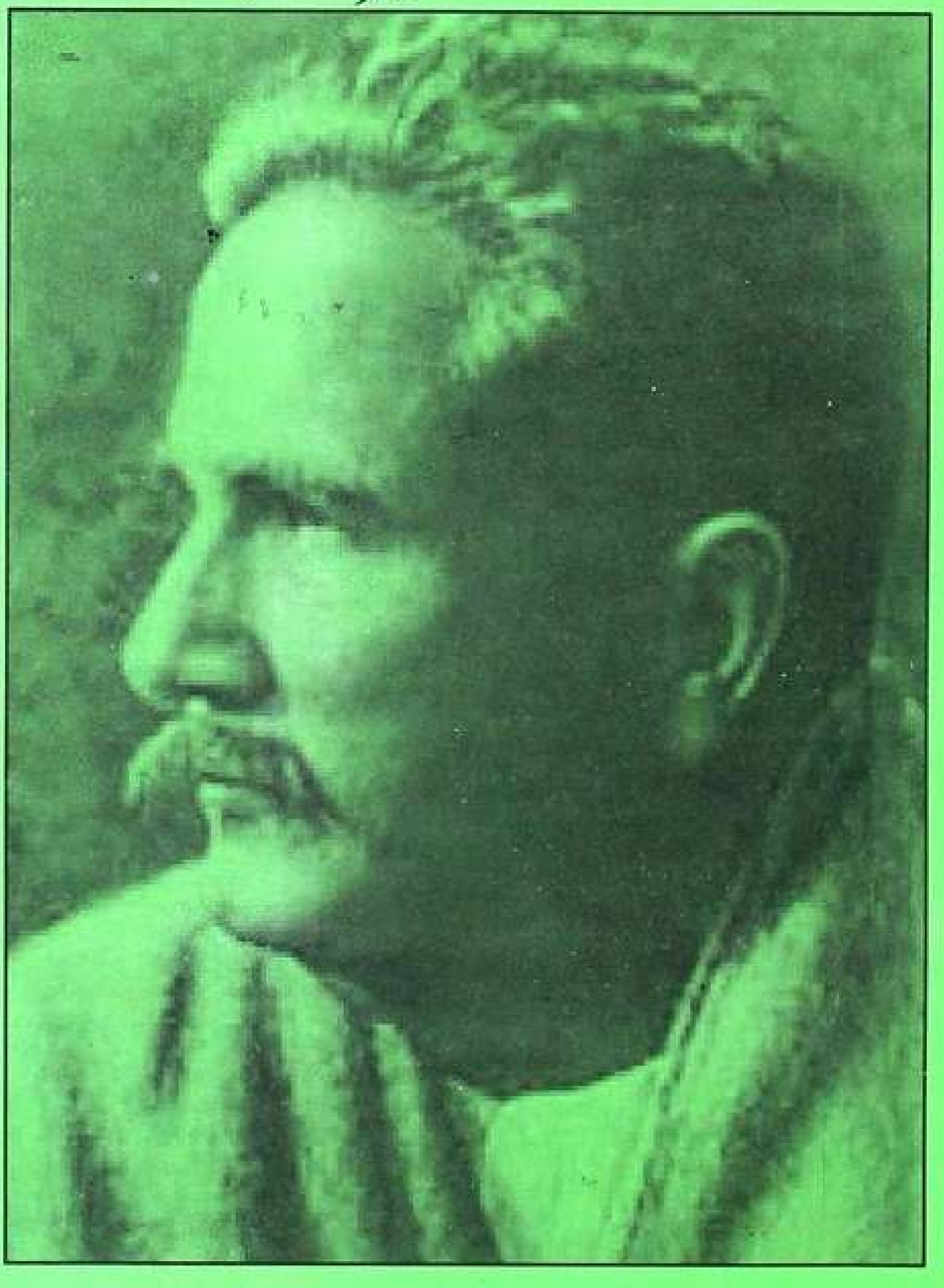

سرسید احمد خاں، حالات وافکار

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

بابائے اردو، سرسید احمد خاں کے شاگرد خصوصی تھے۔ اسی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ جس طرح اُنھوں نے سرسید احمد خاں کو چلتے پھرتے تاریخی، علمی کارنامے انجام دیتے ہوئے دیکھا ہے اس سے نئی نسل کو بھی اُسی انداز میں آگاہ کریں۔

قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو کا المیہ

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کی باقیات کو دہلی سے لاکر کراچی میں مجتمع کیا اور انجمن کے بے جان اور ناتواں جسم میں ایک نئی روح پھونکی۔

۱۹۴۹ء میں اردو کالج قائم کیا۔ بعد میں اردو کالج کے پرنسپل اور اُن کے نامزد کیے ہوئے شرکائے کار نے بابائے اردو کے خلاف جو سازشیں اور غیر اخلاقی و غیر انسانی برتاؤ کیا وہ قابلِ مذمت ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بقلم خود اس کا تفصیلی احوال بڑے کرب کے ساتھ بیان کیا ہے۔

قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

ماھنامہ

قومی زبان

کراچی

بانی: بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

جاری شدہ: پاکستان میں ۱۹۴۸ء

قومی زبان، نومبر ۲۰۰۸ء، جلد ۸۰، شمارہ: ۱۱

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مُدیر

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

بدل اشتراک

فی پرچہ ——— ۱۰ روپے

سالانہ صرف رجسٹری سے ۲۳۰ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ/۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ/۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق و تالیف و تصنیف

ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰

فون: ۴۸۱۱۴۰۶-۴۹۷۳۲۹۶

مضمون نما

اداریہ		۳
اقبال کی تمہیدی علامات	ڈاکٹر بصیرہ عنبرین	۵
اقبال کے اجتہادی تصورات	رابعہ سرفراز	۱۶
مثنوی پس چہ باید کرد...	عظمیٰ عزیز خان	۲۱
مقائسہ ارمغان حجاز، فارسی	افتخار شفیع	۲۹
علامہ اقبال کا ایک منفرد انداز	پروفیسر محمد جان عالم	۳۴
اقبال کا تصورِ اسلام	سید اظفر رضوی	۳۷
اقبال کی زندگی کے اہم پہلو	ڈاکٹر سید وسیم الدین	۴۶
فکر اقبال کا وارث	کیفی حسینی	۴۹
غلام باغ - ناول آف دا ایبسرڈ	ممتاز احمد خان	۵۶
نظیر اکبر آبادی کا فن	روحی طبیبی	۶۳
جمیل الدین عالی کی کتاب بس اک گوشۂ بساط...	ناصر شمسی	۷۸
رفتارِ ادب		۸۶
گرد و پیش		۹۳

اداریہ

ادب لکھنے والوں کو عام طور پر ناقدری زمانہ کی شکایت ہوتی ہے، اکثر کہتے ہیں کہ معاشرے میں مال دار لوگوں کو ہر محفل میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے، جب کہ ہم لوگوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ خاندان کی تقاریب میں عام طور پر ہمارا تعارف نہیں کرایا جاتا جب کہ کسٹم، انکم ٹیکس، ڈی ایم جی گروپ کے افراد اور ڈی ایس پی کو آگے آگے رکھا جاتا ہے اور یہ سب خصوصی مہمانانِ اعزازی کا درجہ حاصل کر جاتے ہیں۔ وہ شکایت کرتے ہیں کہ خود ہمارے معاشرے کا یہ حال ہے کہ اسکول کے مدرسین، شاعروں، افسانہ نگاروں، نقادوں اور محققین کے مقابلے میں صاحبان زر سے زیادہ تر متاثر رہتا ہے۔ ایک شکایت یہ بھی ہے کہ امیر کبیر لکھنے والے اپنے ساتھیوں کو دعوتیں کھلا کر اپنی پبلسٹی کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اپنی ذات پر مضامین لکھوا کر ''بڑے ادیب'' ہونے کا گمان کرتے ہیں۔ پوچھا کہ ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی محفل میں آپ کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے تو جواب دیتے ہیں کہ ہاں اس محدود دنیا میں ہماری انا کی تسکین ہو جاتی ہے، وہاں ہمیں اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے یا پھر کسی کتاب کی تقریب رونمائی میں ہم لوگ خوشی سے پھولے نہیں سماتے کہ ہم ''طبقہ دانشوراں'' میں سے ہیں اور ہم اپنے معاشرے کو اپنی تحریروں کے ذریعے نہ صرف اس کی جمالیاتی دل بستگی کا سامان فراہم کرتے ہیں بلکہ اسے آئینہ بھی دکھاتے ہیں تاکہ وہ اپنے چہرے کے تمام خدوخال دیکھ لیں۔ ہماری تحریریں [redacted] اسے مسرت سے بصیرت تک لے جاتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی شکایت کی عام قاری ڈائجسٹوں کی خواب آور کہانیوں اور جذبات کو اُبھارنے والے رومانی وعشقیہ ناولوں کی زد میں ہے اور ہماری کہانیاں جو عالمانہ سطح لیے ہوئے ہیں انھیں کم افراد پڑھتے ہیں اور تو اور لوگوں میں اچھے ادب کو خرید کر پڑھنے کا رجحان بھی روبہ زوال ہے۔

دراصل یہ ایک جزوی حقیقت ہے۔ اچھا لکھنے والے کی آج بھی قدر ہے خواہ اس محدود طبقے میں سے ہو جو اچھا ادب پڑھتا ہے جس سے اس کی ''تیسری آنکھ'' کھلتی ہے اور کتابیں خریدنا جس کا جزو ایمان ہے۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ ادبی پرچے چھپ رہے ہیں اور لوگ پڑھ رہے ہیں، اخبارات کے ادبی صفحات، ادیبوں، شاعروں، محققین کو اپنے مخصوص کالموں میں خوب خوب جگہ دے رہے ہیں اور کچھ ٹی وی چینلوں پر ادیبوں کو اہمیت دی جارہی ہے۔ لہٰذا ادیبوں کو کسی قسم کی احساسِ کمتری اور بے بضاعتی کی شکایت نہیں ہونا چاہیے۔ جو شخص تخلیقی ادب لکھ رہا ہے وہ خود مسرت کی منزلوں میں ہے، اس کے لیے تو یہ ہی اثاثہ کافی ہے اور باقی رہی یہ بات کہ معاشرے میں سب اسے دیکھتے ہی سلوٹ کریں تو یہ امریکا اور یورپ میں بھی ناممکن ہے جہاں ادبی کتابیں دھڑا دھڑ فروخت ہوتی ہیں اور یہ تمام کتب خانوں میں قارئین کو باقاعدگی فراہم کی جاتی ہیں۔ دراصل تحریر کا عمل بذات خود ایک حسین عمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اچھا لکھتے جایئے ادب پڑھنے والوں کا طبقہ خود آپ کی قدر کرے گا۔

حسبِ روایت نومبر ۲۰۰۸ء کے اس شمارے میں ہم اقبال پر مضامین دے رہے ہیں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ قارئین ان سے استفادہ کریں گے۔

انجمن کی مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۔ اردو ناول کے چند اہم زاویے	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	160/-
۲۔ سرسید احمد خاں، حالات و افکار	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۳۔ افکار عالیہ	خان رشید/ قاضی قیصر الاسلام	130/-
۴۔ ملت اسلامیہ	علی نواز میمن/ صفوت قدوائی	250/-
۵۔ غالب کے چند پہلو	شمس الرحمٰن فاروقی	100/-
۶۔ پاکستان ایک اشرافی ریاست کی معیشت	ڈاکٹر عشرت حسین	480/-
۷۔ انجمن ترقی اردو کا المیہ	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۸۔ منتشر یادیں	نور الحسن جعفری	150/-
۹۔ اردو کی منظوم داستانیں	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	350/-
۱۰۔ غالب کی بعض تصانیف	کالی داس گپتا رضا	120/-
۱۱۔ تاریخ انجمن بابائے اردو کے بعد	شہزاد منظر/ تکملہ: ادیب سہیل	175/-
۱۲۔ اشاریہ اردو (جلد دوم)	مصباح العثمان	100/-
۱۳۔ تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت (جلد اول)	سید ہاشمی فرید آبادی	250/-
۱۴۔ تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت (جلد دوم)	سید ہاشمی فرید آبادی	300/-
۱۵۔ غالب ایک مطالعہ	ممتاز حسین	150/-
۱۶۔ غالب درونِ خانہ	کالی داس گپتا رضا	350/-
۱۷۔ اردو ادب کی جستجو	رالف رسل	350/-
۱۸۔ مقالات مرزا محمد سعید	شیما مجید	125/-
۱۹۔ جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری	ڈاکٹر ناہید قاسمی	400/-
۲۰۔ غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ	خلیق انجم	350/-
۲۱۔ نقش ہائے رنگ رنگ	مترجم: ڈاکٹر صابر آفاقی	250/-
۲۲۔ جدید اور مابعد جدید تنقید	ناصر عباس نیر	300/-
۲۳۔ مجنوں گورکھپوری حیات و فن	ڈاکٹر عبدالستار نیازی	400/-
۲۴۔ ممتاز حسن احوال و آثار	فرزانہ ناہید گیلانی	225/-
۲۵۔ پاکستان میں اردو دوہے کی روایت	کنول ظہیر	250/-
۲۶۔ اردو افسانے کے فروغ میں ساقی کا کردار	ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز	350/-
۲۷۔ متنی تنقید	ڈاکٹر خلیق انجم	300/-
۲۸ جرنل فی ہند (جلد چہارم)	جمیل الدین عالی	250/-
۲۹۔ ندائے دوست	شاہت علی خان	175/-

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی۔۷۵۳۰۰

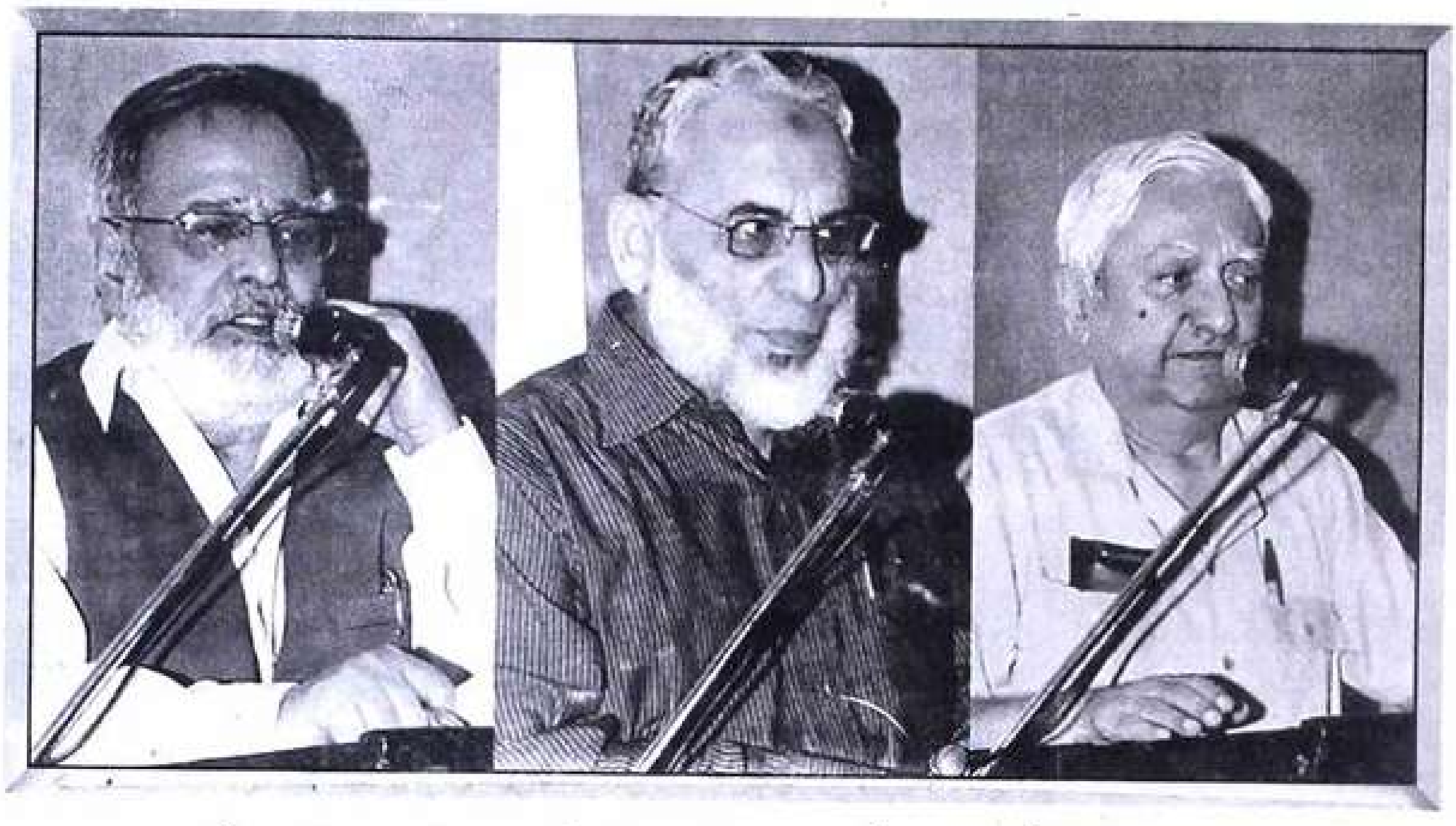

رالف رسل تعزیتی ریفرنس سے صدر انجمن جناب آفتاب احمد خان، محمود عزیز اور اُمراؤ طارق خطاب کر رہے ہیں

اس محفل کے شرکاء

مطبوعاتِ انجمن ترقی کے لیے لکھے گئے پیش لفظ کا مجموعہ

حرفے چند

(جلد چہارم)

از

جمیل الدین عالی

انجمن کی شائع کردہ کتابوں کے تجزیاتی مقدمے جن سے ۱۹۶۳ء سے
تا حال علمی، ادبی اور تحقیقی سرگرمیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے

قیمت: ۲۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

محمد حسین آزاد

(جلد اوّل و دوم)

از

ڈاکٹر اسلم فرخی

جلد اوّل: صفحات: ۴۱۱ قیمت: ۲۵۰ روپے

جلد دوم: صفحات: ۵۷۸ قیمت: ۳۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین ☆

اقبال کی تلمیحی علامات

علاماتِ اقبال کا ایک اختصاصی پہلو تاریخی تلمیحوں کو علامتی رنگ و آہنگ سے ہم کنار کر کے انھیں حسن و معنویت عطا کرنا ہے۔ تلمیحی ابعاد کے حامل ان علائم و رموز میں اسلامی و غیر اسلامی دونوں طرح کے تاریخی اہمیت کے اشخاص و وقائع شامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اپنے مطمحِ نظر کی ترسیل کرتے ہوئے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں اور جو تاریخی کردار یا واقعہ انھیں اس ضمن میں قریب تر محسوس ہوتا ہے اسے کمال درجے کی مہارت سے علامتی پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ خصوصاً ان کے ہاں قرآنی تلمیحوں کی علامتی حیثیت لائقِ تحسین ہے جن کے تحت وہ نہ صرف انبیا کی شخصی خوبیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں بلکہ ان سے متعلق قصص بھی ان کے لیے خاص کشش رکھتے ہیں۔ توقیت زمانی سے قطع نظر بلحاظِ تعداد دیکھا جائے تو اس قبیل کی علامتوں میں اقبال نے حضرت موسیٰؑ سے متعلق تلمیحوں کو اولیت دی ہے اور انھیں اکثر مقامات پر علامتی رنگ میں ترسیلِ مطلب میں معاون ٹھہرایا ہے۔ اس سلسلے میں موسیٰؑ، کلیم، کلیم اللہ، کلیم الٰہی، شعیب و شبانی، طورِ نخلِ طور، وادیِ ایمن، لاتخف، سینا، ارنی، ارنی گو، لن ترانی، تجلی، یدِ بیضا، عصائے موسوی، فرعون، سامری اور قارون کی تلمیحات نے خاص طور پر علامتی رنگ اختیار کیا ہے۔ یہ وہ تلمیحی علامتیں ہیں جو کلام اقبال میں عہدِ حاضر کے مسلمانوں کو قوتِ عمل کو مہمیز کرتی نظر آتی ہیں اور ان کے ذریعے حق و باطل کی آویزش آئینہ ہو گئی ہے، مثلاً چند شعر:

شرارے وادیِ ایمن کے تو بوتا تو ہے لیکن — نہیں ممکن کہ پھوٹے اس زمیں سے تخمِ سینائی!

(ب د، ۲۴۴)

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک — مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا!

(ب ج، ۲۵)

قلندر جُز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا — فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

(۳۲،//)

☆ شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم!
(۶۰،//)

اسی طرح ابراہیم اور آزر کی علامتیں بھی اکثر اشعار میں نمود کرتی ہیں اور اقبال نے انھیں بالترتیب بت شکنی و بت گری کی رمزوں کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ وہ خلیل اللہ کے اعلائے کلمۃ الحق کرنے کو سراہتے ہوئے ان کے آتشِ نمرود میں بے خوفی سے کود جانے کے واقعے کو حق گوئی و بے باکی کی علامت قرار دے کر اپنے کلام کی معنی خیزی میں قابلِ قدر اضافہ کر دیتے ہیں، جیسے:

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
(ب د،۱۶۰)

آتشِ نمرود ہے اب تک جہاں میں شعلہ ریز
ہو گیا آنکھوں سے پنہاں کیوں ترا سوزِ کہن؟
(۲۴۰،//)

آزر کا پیشہ خارا تراشی
کارِ خلیلاں خارا گدازی!
(ب ج،۷۲)

اقبال کے کلام میں قرآنی تلمیحات پر مبنی دیگر علامتوں میں حضرت عیسیٰؑ کی مسیحا نفسی مردِ مومن کی بیداریِ قلب کی علامت بن گئی ہے اور وہ آپؑ کے ''قم باذن اللہ'' کے معجزے کو تحرک و حرارت پیدا کرنے کے لیے رمزی انداز میں موزوں کر دیتے ہیں۔ اسی طرح حضرت سلیمانؑ سے متعلق قرآنی قصہ علامتی رنگ و آہنگ میں ڈھل کر نئے معنی دیتا ہے۔ چناں چہ یہاں ''نگینِ سلیمانؑ'' قدر و منزلت اور ارفعیت اور ''مورِ بے پر'' یا ''مورِ بے مایہ'' اُمتِ مسلمہ کی موجودہ ابتر حالت کی علامتی نمائندگی کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اقبال نے ''یوسفِ گم گشتہ'' کی تلمیحی ترکیب کو علامتی پیرائے میں برت کر اپنی شاعری میں ندرت و جدت پیدا کر دی ہے۔ کہیں یہ اسلاف و اخلاف کے درخشاں ماضی کی علامت ہے تو کہیں عہدِ حاضر کے غافل مسلمان کی، کہیں ''خونِ زلیخا'' نوجوانانِ ملّت کی علامت ہے، (جن کے اندر وہ تڑپ پیدا کرنا چاہتے ہیں) تو کہیں یوسف کا کنعان سے مصر کی طرف ہجرت کرنا اسلام کے لامحدود تصورِ ملت کا ترجمان بن جاتا ہے۔ علامہ کے اس قبیل کے چند علامتی شعر ملاحظہ ہوں:

مشکلیں اُمتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
(۱۶۹،//)

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
(۲۰۵،//)

جس سے تیرے حلقۂ خاتم میں گردوں تھا اسیر
اے سلیماں! تیری غفلت نے گنوایا وہ نگیں!
(۲۲۱،//)

''قم باذن اللہ'' کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن
(ب ج،۱۶۱)

''دمِ جبرئیل''، ''قوتِ پرواز'' اور ''صورِ اسرافیل'' انقلاب کی علامتیں ہیں، جنھیں اقبال مردِ مسلمان میں دیکھنے کے متمنی ہیں اور اپنی اس خواہش کا اظہار انھوں نے کہیں رجائیت سے کیا تو کہیں یہ تذکرہ مایوسی کے عالم میں ملتا ہے۔ نیز ''لات و منات'' کی قرآنی تلمیحیں علامتی رنگ و آہنگ میں نئی تعبیرات سے ہم کنار نظر آتی ہیں۔ علامہ نے ان بتوں کو کبھی شر کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے اور کبھی یہ قدامت پسندی اور فنا و پستی کے علائم کے طور پر نمود کرتے ہیں:

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا — تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا
(ب د، ۲۷۱)

مصلحتاً کہہ دیا میں نے مسلماں تجھے — تیرے نفس میں نہیں، گرمیِ یوم النشور!
(ض ک، ۵۱)

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر — زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات!
(ا ح، ۲۶)

قرآنی تلمیحات پر مبنی علامتوں ہی کے ذیل میں ابلیس کی علامتی معنویت کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ درست ہے کہ کلامِ اقبال میں یہ تلمیح زیادہ تر شعری کردار کی حیثیت رکھتی ہے تاہم اس کے رمزی ابعاد بھی لائقِ اعتنا ہیں۔ شعری کردار کے طور پر ابلیس کے اندر شر کے ساتھ ساتھ بہت سے مثبت خصائص دیکھے جاسکتے ہیں جن کی علامہ نے اکثر و بیشتر توصیف کی ہے۔ اس زاویے سے یہ کردار نہ صرف احساسِ ذات رکھتا ہے بلکہ اپنی فراق پسندی، قوت و آزادی، فعالیت، سوز و ساز، تمنا و جستجو، ہنگامہ خیزی، تحرک و حرارت اور بے باکی و گستاخی کے باعث کبھی کبھی عام انسان سے ماورا ہو کر اتنا اہم ہو جاتا ہے کہ اس کی عدم موجودگی سے اقبال کو یہ دنیا کشش سے عاری دکھائی دیتی ہے (مزی اندر جہانِ کور ذوقے + کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد، پیامِ مشرق، ۱۳۲) نیز شر کی قوت اس کردار میں مزید خوبصورتی پیدا کر دیتی ہے۔ خالصتاً علامتی حوالے سے دیکھیں تو اردو کلام میں یہ تلمیح شر پسند افراد و اقوام کی نمائندگی کرتے ہوئے ابھرتی ہے اور جہاں کہیں مغرب کے ارباب سیاست کی شاطرانہ چالوں سے اس کا رشتہ جوڑا گیا ہے وہاں رمزیت و ایمائیت بہت گہری ہو گئی ہے۔ یہاں ''ابلیس مجسم تکبر ہے لیکن اس کے کردار کی پختگی، یزداں گریزی، ستیزہ کاری، شر پسندی، نخوت، جذبۂ تفوق، پندار پرستی اور اصول پرستی اقبال کی رومانویت سے ہم آہنگ ہو کر دیدہ زیب ہو جاتی ہے۔ اقبال کا ابلیس خشک اور خطرناک نہیں بلکہ حد درجہ لڑاکو، جذباتی، شریر، چونچال اور شوخ ہے۔ وہ اپنی قوت و جبروت، جذبۂ عمل اور اولوالعزمی پر نازاں ہے۔ عصر رواں کے انسانوں کو زیاں کو ابلیس اپنی کامرانی اور فتح مندی کہتا ہوا نظر آتا ہے اور اب اس کی نظروں میں یہ دنیا آدم سے خالی ہے''(۱) ذیل کے شعر دیکھیے جو اردو کلام میں ابلیس کی تلمیح کی علامتی جہتوں کو آئینہ کر دیتے ہیں:

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک!
(ب ج، ۱۶۲)

اللہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسا — ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

قرآنی تلمیحوں پر مبنی علائم و رموز کے ساتھ ساتھ اقبال نے بعض اوقات اسلامی و غیر اسلامی تاریخ پر مشتمل تلمیحات کو بھی علامتی پیرایۂ بیان عطا کیا ہے۔ اسلامی تاریخ کی شخصیات میں سرِ فہرست نبیِ آخر الزماں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے، جن کے مقابل وہ ابولہب کی تلمیح لا کر دو مختلف اور متضاد مکاتیب فکر کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ ''مصطفویؐ'' اور ''بولہبی'' حق و باطل کے علائم ہیں جن کے تضاد و تقابل سے اقبال نے بے مثل نکات اخذ کیے ہیں، مثلاً لکھتے ہیں:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی
(ب د، ۲۲۳)

اس کے علاوہ وہ حضرتِ علیؓ کے ساتھ ''مرحب'' اور ''عنتر'' کی تلمیحیں لا کر ''اسد اللّٰہی و ید اللّٰہی'' کو حق اور ''مرحبی و عنتری'' کو کفر و استبداد کے علاماتی تناظر میں پیش کرتے ہیں اور اس سے ان کی غرض مسلمانوں میں حرکت و حرارت عمل پیدا کرنا ہے۔ اسی طرح حسینیت اور یزیدیت بالترتیب صبر و استقامت اور ظلم و بربریت کی علامتیں ہیں۔ اقبال کے نزدیک: ''کربلا کا واقعہ محض ایک تاریخی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ وقت کے تسلسل کا ایک لمحہ ہے جو لافانی بن گیا ہے اور جسے اقبال نے اپنے نادر اور ہمہ گیر تخیل کے ذریعے اسیر کر لیا ہے۔ یہ رمز ہے حق و باطل اور حریت و استبداد کے درمیان ابدی پیکار کا اور حسینؓ کا عزم و استقلال اور صبر و ثبات اعلان ہے اس امر کا کہ حکم، حق اور حکمت اٹل اور جاودانی ہیں۔ یہ معرکہ خیر و شر زندگی کے ہیولیٰ میں پیوست ہے اور تاریخ کے ہر دور میں نہ جانے کتنی بار دہرایا جا چکا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے داعی حسینؓ کی سرفروشی انسان کی روح کا ترانۂ سرمدی ہے، جس کے زیر و بم کو انسانیت کے کان کبھی فراموش نہیں کر سکے۔'' (۲) خاص طور پر علامہ نوجوانِ ملت میں حسینؓ کا سا ذوق و شوق دیکھنے کے شدت سے خواہاں نظر آتے ہیں:

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے — وہی فطرتِ اسد اللّٰہی، وہی مرحبی، وہی عنتری
(ب د، ۲۵۳)

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیریؓ — بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی!
(۷۳،//)

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں — گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات!
(۱۱۲،//)

یوں بھی ہوا ہے کہ تاریخِ اسلام کے نامور اشخاص ایک ہی شعر میں علامتی معنویت دینے لگتے ہیں اور اقبال نے اس طریق کار سے اصلاحِ احوال کی بھرپور کاوش کی ہے، جیسے:

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے — گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ؟
(ب ج، ۲۳)

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے — رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی!
(ض ک، ۵۱)

اسلامی تاریخ کی دیگر نمایاں شخصیات میں اقبال نے سلاجقۂ بزرگ کے اولین حکمران طغرل بیگ اور آخری سلجوقی بادشاہ سنجر کے ساتھ ساتھ سلطان سلیم عثمانی کے زور وہیبت اور شان وشکوہ کو مسلمانوں کے عروج کی علامت بنا دیا ہے:

شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود! فقرِ جنید و بایزید، تیرا جمال بے نقاب!

(ب ج، ۱۱۳)

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر!

(ض ک، ۷۶)

اسی ذیل میں ہندوستان کی مسلم تاریخی شخصیات میں محمود وایاز اور تیمور علامتی حیثیت رکھتے ہیں۔ محمود کی تلمیح جلال وحشمت، بت شکنی اور شان وشکوہ کے ساتھ ساتھ حکمرانی وسلطانی کی علامت ہے جب کہ ایاز کہیں مجبوری ومقہوری کی علامت ہے تو کہیں عاشقِ صادق کی— تیمور کی تلمیح ظلم وبربریت کی رمزی صورت رکھتی ہے یا جنگجویانہ فطرت کے اظہار کے لیے نمود کرتی ہے۔ ان حوالوں سے علامہ کا علامتی رنگ ملاحظہ ہو:

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز!

(ب ج، ۲۶)

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات!

(۱۱۲، //)

حاصل اس کا شکوہِ محمود فطرت میں اگر نہ ہو ایازی!

(ض ک، ۸۹)

تاریخِ غیر مسلم کے مشاہیر میں اقبال یونان کے فاتحِ جلیل اسکندر اعظم یا اسکندر مقدونی سے وابستہ تلمیح ''آئینہ سکندری'' کو علامتی آہنگ دیتے ہیں اور اسے شان وشوکت کی علامت کے طور پر متعارف کروا کر معنی مفید کا حصول کرتے نظر آتے ہیں۔ دارا قوت وحشم کی، جمشید (اور اس کا جامِ جہاں نما) شاہانہ تکلف کی، اردشیر سیاست ومذہب کی یکتائی کی، نوشیروانِ عادل (خسرو اول ملقب بہ کسریٰ) داد وانصاف اور نبت کی، خسرو پرویز (خسرو دوم) جاہ وجلال اور زر پرستی کی اور چنگیز خان ظلم واستبداد کی علامتوں کے طور پر ابھرے ہیں۔ اسی طرح بعض مواقع پر اقبال نے ایرانی وردمی اکاسرہ قیاصرہ کو کلی طور پر شوکت وطنطنے کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے یا ان کے ہاں چینی وترکستانی خطوں کے معروف حکمرانوں کا تلمیحیں فغفور وخاقاں کے القاب کے ساتھ مطلق العنانی اور استعماریت کے علائم بن گئی ہیں۔ متذکرہ تلمیحی علامتوں کا رنگ ڈھنگ اقبال کے ذیل کے اشعار سے بخوبی مترشح ہوتا ہے:

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز!

(ب ج، ۱۶)

نہ ایراں میں رہے باقی، نہ توراں میں رہے باقی وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ (//،۲۳)

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی! (//،۴۰)

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن کسی جمشید کا ساغر نہیں میں (//،۸۶)

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق (//،۸۷)

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری! (//،۱۱۸)

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں (اح،۱۳)

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا (//،۱۵)

یہاں سکندر، دارا اور پرویز کی علامتیں خصوصاً لائقِ اعتنا ہیں جن کی وساطت سے علامہ نے اپنی بے مثل فکریات کا اظہار عمدگی سے کیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ان علامتوں کی معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

'''سکندر'، 'دارا' اور 'پرویز' کی تاریخی علامتوں کو اقبال نے سرمایہ دارانہ عہد کی شعری علامتوں میں استعمال کیا ہے۔ ان استحصالی علامتوں کو بیسویں صدی کا بڑھتا ہوا عوامی شعور پسپا کر رہا ہے کہ اس شعور کی زد میں سارے استحصالی ادارے آگئے ہیں اور ان کی تیزی سے شکست و ریخت ہو رہی ہے۔ کوہکن (مزدور) آگے بڑھ کر پرویزی (حکومت) پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور اب محنت کش کی غلامی ختم ہو رہی ہے اور ایک جہانِ دگر نئے بدلتے ہوئے سماجی ڈھانچے سے وجود پانے والی علامت ہے جو ہر قسم کے جبر و تشدد، استبداد اور غلامی سے پاک ہوگی اور جہاں انسان ایک مثالی زندگی شروع کر سکیں گے...'' (۳)

شعرِ اقبال میں تلمیحی علائم و رموز میں بعض مقامات پر دنیائے علم و فلسفہ کی مؤثر شخصیات کو بطور علامت پیش کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ خاص طور پر ایسی علمی و فلسفیانہ شخصیات کو وجدان اور عشق کے نمائندہ اشخاص مثلاً حضرت بلالؓ، جنید بغدادی، عطار اور رومی وغیرہ کے ساتھ لاکر بڑے مؤثر طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ اقبال فارابی، بوعلی سینا، رازی اور غزالی جیسے مسلم فلاسفہ کے تحیر و تعقل کو تحسین و ستائش کی نظر سے دیکھتے ہیں اور عہدِ نو کے مسلمانوں کے لیے راہِ عمل متعین کرتے ہوئے ان کے تفکر و تفلسف کو بطور مثال پیش کرتے ہیں، جیسے:

یا حیرتِ فارابی، یا تاب و تبِ رومی — یا فکرِ حکیمانہ، یا جذبِ کلیمانہ!
(ب ج، ۶۷)

مقامِ ذکر، کمالاتِ رومی و عطار — مقامِ فکر، مقالاتِ بو علی سینا
(ض ک، ۲۳)

دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم — دلِ جنید و نگاہِ غزالی و رازی
(ا ح، ۴۳)

علاماتِ اقبال کا ایک نمایاں حصہ فنی و ادبی تاریخ کی تلمیحوں پر مبنی ہے جن میں بہزاد، خضر، آبِ حیات، شیریں، فرہاد و خسرو، لیلیٰ و مجنوں اور سعدی و سلیمیٰ خاص طور پر نئی معنوی تعبیرات لیے ہوئے ہیں۔ بہزاد محض فنِ مصوری کی علامت نہیں بلکہ ان تمام فنون کی ترجمانی کرتا ہے جو اقبال کے نزدیک محنتِ شاقہ کے مقتضی ہیں۔ اس علامت کے وسیلے سے وہ اس امر پر اظہارِ افسوس بھی کرتے ہیں کہ عہدِ حاضر کا فن کار خونِ جگر صرف کرنے سے گریزاں ہے:

مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد — کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی!
(ض ک، ۱۲۴)

اقبال نے خضر کو مبارک قدمی، دستگیری اور ابدیت کی علامت ٹھہرانے کے ساتھ ساتھ بلند حوصلگی، رجائیت اور کوشش ناتمام کے علامتی معانی بھی بخشے ہیں، بعینہٖ ''آبِ حیات'' حیاتِ جاوداں اور مقصد آفرینی کی علامت ہے جس کے لیے تشنہ کامی اور جہدِ مسلسل ضروری ہے۔ قصۂ آبِ حیات کا دوسرا نمایاں کردار سکندر ذوالقرنین ملوکانہ سرشت اور محرومی کے رمزی ابعاد رکھتا ہے اور علامہ نے ان تمام تلمیحی حوالوں کو علائم و رموز میں ڈھال کر بڑے تازہ مضامین تشکیل دیے ہیں، جیسے:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی — رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
(ب د، ۱۰۷)

گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی — فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ نا و نوش!
(//، ۲۵۷)

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ — پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو!
(ب ج، ۱۳)

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات!
(//، ۱۰۷)

اقبال نے شیریں، فرہاد اور خسرو کے حسن و عشق پر مبنی ادبی و تاریخی قصے کو پیش نظر رکھ کر شیریں، غمِ فرہاد، محنتِ فرہاد، تیشۂ بے ستوں، سنگِ گراں، جوئے شیر، دولتِ پرویز، شکوہِ خسروی اور کوہکن کے تلمیحی لفظوں کو علامتی پیکروں میں مبدل کر دیا ہے۔ وہ ساسانی بادشاہ خسرو پرویز (کسریٰ) کی شان و شوکت اور امارت سے جو ''گنج بادآورد'' کی صورت میں معروف ہے نئے علامتی معنی اخذ کرتے

ہوئے اسے ملوکیت و استعماریت کی رمز کے طور پر متعارف کراتے ہیں۔ خاص طور پر انھوں نے اس علامتی جہت سے اپنے تصورِ فقر کی عمدگی سے توضیح کر دی ہے، مثلاً:

گو فقر بھی رکھتا ہے اندازِ ملوکانہ ناپختہ ہے پرویزی، بے سلطنتِ پرویز!
(ب ج، ۲۶)

تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
(ا ح، ۴۸)

فرہاد کی تلمیح سخت کوشی اور محبتِ پیہم کی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ کم مائیگی کی ترجمان ہے اور شیریں کا فتنہ انگیز حسن جذبۂ عشق کی جرأت و ہمت کا مظہر ہے جو خسرو و پرویز کے ظلم و استبداد کے باوجود ماند پڑتا دکھائی نہیں دیتا۔ خصوصاً ''تیشے'' کی علامتِ فرہاد کے کردار کو زیادہ واضح کر دتی ہے۔ اس علامت پر تبصرہ کرتے ہوئے سید وقار عظیم نے اپنے مضمون ''عشرتِ پرویز اور غمِ فرہاد'' میں لکھتے ہیں:

> ''غمِ فرہاد اور عشرتِ پرویز کی حکایت میں فرہاد اور پرویز تو اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہی ہیں، تیشے نے بھی ایک بے جان چیز ہے، ایک اہم حصہ لیا ہے۔ ترقی کے مختلف مدارج و مراحل طے کرنے اور عروج کی منتہا تک پہنچنے کے لیے انسانی خودی کو کارگہِ حیات میں مسلسل کشمکش اور جدوجہد میں مصروف رہنا ہوتا ہے... کشمکش، جدوجہد، محنت اور سخت کوشی کے اس عمل میں انسان کو جس آلۂ کار کی ضرورت ہے اس کا سب سے موثر مظہر تیشہ ہے۔ عشق گرہ کشا اپنا فیض عام کرنے کے لیے جس وسیلے کی مسلسل رفاقت کا طالب ہے، وہ وسیلہ بھی اقبال کے شعروں میں تیشے کا نام پاتا ہے...'' (۴)

فرہاد اور تیشے کے حوالے سے اقبال کا علامتی رنگ کچھ یوں ہے:

حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا تو نے فرہاد! نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل
(ب د، ۶۱)

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی!
(۲۵۹، ر ر)

بعض اوقات شیریں، فرہاد اور خسرو کے تلمیحی علائم کی وساطت سے اقبال کے کلیدی تصورات و نظریات کا ابلاغ بھی بڑے موثر طور پر ہوتا ہے۔ اس قبیل کے اشعار میں 'پرویز' شہنشاہیت و ملوکیت اور عیش و طرب، 'فرہاد' رنج و محن اور عزم و ہمت اور 'شیریں' جدید تعلیم و تہذیب کے علائم و رموز قرار پاتے ہیں، چند شعر دیکھیے:

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ
(ب د، ۲۰۹)

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا! طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی!
(ب ج، ۴۰)

اسی طرح بعض اشعار میں اقبال نے خسرو و فرہاد کی تلمیحوں کے ڈانڈے اپنے متعین کردہ شعری معیار سے جوڑ کر نئے علامتی مفاہیم ابھارے ہیں اور اسی تناظر میں یہ تاریخی کردار 'شعرِ عجم' پر تنقیدی نظر ڈالنے میں بھی بڑے موثر ثابت ہوئے ہیں، جیسے:

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی!
(ب ج، ۱۱)

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دل آویز اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
(ض ک، ۱۲۸)

کلی طور پر شیریں، فرہاد اور خسرو پرویز کی تلمیحی علامتوں پر ڈاکٹر عبدالمنان کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

''شیریں فرہاد کا قصہ اردو شاعری کی رنگین داستانوں کا ایک اہم موضوع رہا ہے اور جہاں حسن و عشق کی بات آتی ہے وہاں یہ قصہ کچھ زیادہ تقویت بخشتا ہے لیکن اقبال اس تلمیحی واقعے کے دو اہم کرداروں کے سہارے اپنے مخصوص نظریات و افکار کے نگار خانے سجاتا ہے کہ اس میں چند ایسے اجزا ملتے ہیں جو ان کے فلسفۂ حیات کے رنگوں سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ اس واقعے میں شیریں کا کردار اقبال کے لیے کچھ زیادہ مددگار ثابت نہیں ہوتا کہ یہ اپنی شانِ محبوبی کے باوجود بے انتہا خاموش اور غیر فعال کردار ہے جو ایک ایسے محبوب کی طرح نظر آتا ہے جس سے محبت کی جا سکتی ہے بس۔ لیکن فرہاد کا کردار اقبال کے فلسفیانہ تصورات کی وضاحت میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ فرہاد کا جذبۂ عشق عزم و حوصلہ سے معمور ہے اور وہ چاک دامانی اور آہ و نالہ کو اپنا منصب نہیں سمجھتا اور وصالِ محبوب کی دولت کی حصول یابی کے لیے تقدیر کے معجزات کا سہارا نہیں لیتا۔ وہ اپنے زورِ بازو کو سب کچھ سمجھ کر تیشے کو رفیق سمجھتا ہے اور اپنے محبوب کے درمیان حائل کوہِ گراں کو پاش پاش کرتا ہے۔ اقبال کی نکتہ رس اور دقیقہ شناس فکر فرہاد کے عزم و عمل پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح فرہاد، اقبال کی شاعری میں ایک ایسی علامت ہے جو زندگی کی حقیقت سے آشنا ہے اور ''جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں'' کو اس کے اجزا متصور کرتا ہے... کوہکن اس شخص کی علامت ہے جسے اپنا لعلِ مقصود حاصل کرنا ہے اور 'جوئے شیر' وہ قیمتی عظیم مقصد ہے کہ جس کی حصول یابی دراصل محبوب کا وصال ہے اور 'سنگِ گراں' ایسی رکاوٹ ہے جو لعلِ مقصود کی راہ میں حائل ہے اور تیشہ دستِ جفاکش ہے جس کے سہارے سنگِ گراں کاٹا جاتا ہے اور طالب کے لیے مطلوب تک رسائی حاصل کرنے کی راہ ہموار کرتا ہے...'' (۵)

علامہ نے لیلیٰ و مجنوں اور سعدی و سلیمیٰ کی ادبی تلمیحوں کے علامتی و رمزی ابعاد ابھارتے ہوئے بھی بڑے معنی خیز نکات پیدا کیے

ہیں۔ وہ قیس بن عامر (قیس عامری) اور لیلیٰ بنتِ سعد کی روایتی داستانِ عشق کو علامتی پیکر بخشتے ہوئے لیلیٰ، قیس، ناقۂ لیلیٰ، محمل، دنبالۂ محمل، کجاوے، صحرا و دشت، دلِ ویراں، وادیِ نجد، دشت و جبلِ نجد اور بادیہ پیمائی وغیرہ کے مروج معانی ہی بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ اب یہ شعری تلازمات جذبۂ عشق کے وسیع تر تناظر میں پیش ہوتے ہیں اور ان سے پیغامبری کا فریضہ بھی بطریقِ احسن انجام پایا ہے۔ اس منفرد رنگ کے تحت قیس دورِ حاضر کے بے عمل مسلمان کی علامت ہے اور لیلیٰ سے مراد سرزمینِ حجاز کی وہ روشنی ہے جو منزل کا پتا دیتی ہے جب کہ محمل یا کجاوے کی رمزامت مسلمہ کی جانب بلیغ اشارہ کرتی ہے۔ ان تمام علائم و رموز کو اپنے کلام میں سموتے ہوئے اقبال نے متنوع پیرائے اپنائے ہیں۔ کہیں رجائی و دعائیہ انداز تو کہیں علامہ کی اُمتِ مسلمہ سے وابستہ تمنائیں یاس و حسرت کے مضمون کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ تاہم صورت کوئی بھی ہو ان کا مطمحِ نظر افرادِ ملت کی اصلاح و تجدید ہی ٹھہرتا ہے، جیسے:

آرزو نورِ حقیقت کی ہمارے دل میں ہے — لیلیٰ ذوقِ طلب کا گھر اسی محمل میں ہے
(ب د، ۴۹)

وادیِ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا — قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
(۱۶۸،//)

دیکھ! یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار — قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
(۱۳۲،//)

پیدا دلِ ویران میں، پھر شورشِ محشر کر — اس محملِ خالی کو، پھر شاہدِ لیلا دے
(۲۱۲،//)

نیز دیکھیے عہدِ جدید کے قیس (مردِ مسلماں سے مخاطبت کے دوران اقبال نے کیا خوب ندرت دکھائی ہے اور علامتی آہنگ کس قدر گہرا ہو گیا ہے:

ترا اے قیس! کیوں کر ہو گیا سوزِ دروں ٹھنڈا؟ — کہ لیلیٰ میں تو ہیں اب تک وہی انداز لیلائی
(۱۵۴،//)

تو رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول! — لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!
(ض ک، ۷۲)

خوبروئے عرب محبوباؤں سعدیٰ و سلیمیٰ کو اقبال نے تہذیبِ حجازی کی اعلیٰ قدروں کی علامتوں کے طور پر متعارف کرایا ہے اور اس طریقے سے وہ افرادِ ملت کے دلوں میں اسلام اور خاکِ یثرب کی محبت جاگزیں کر دیتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو ''بت کدۂ چیں'' سے ''رختِ جاں'' اُٹھا لینے کی ترغیب دیتے ہیں اور انھیں کلی طور پر ''محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دینے کے متمنی ہیں۔ جبھی تو انھیں طلسمِ ماہ سیمایانِ ہند، ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور سلیمیٰ کی نظریں ''پیغامِ خروش'' دیتی دکھائی دیتی ہیں:

رختِ جاں بت کدۂ چیں سے اُٹھا لیں اپنا　　سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
(ب د، ۱۳۲)

ٹوٹنے کو ہے طلسمِ ماہ سیمایانِ ہند　　پھر سلیمیٰ کی نظر دیتی ہے پیغامِ خروش
(//، ۱۸۹)

شعرِ اقبال میں تلمیحی علامات کے یہ متنوع ابعاد اس حقیقت سے باخبر کراتے ہیں کہ علامہ کے علامتی نظام میں تلمیحیں خواہ قرآنی ہوں یا اسلامی و غیر اسلامی تاریخ کی ہوں، علمی و فلسفیانہ ہوں یا فنی و ادبی — تمام صورتوں میں ترسیلِ مطلب مقدم ہے۔ چناں چہ ان مختلف جہتوں کے نمائندہ اشخاص محض تاریخ کے اوراق کے اہم کردار نہیں ہیں بلکہ یہ اپنے مخصوص ''کرداری اوصاف'' کے باعث ملتِ اسلامیہ کو درپیش مختلف مسائل کے حل میں معاونت کرتے ہیں۔ اقبال نے ان کی وساطت سے افرادِ ملت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے اور اپنی علامتی معنویت کے اعتبار سے ان کی اس قبیل کی تلمیحیں ماقبل کے شعرا پر فوقیت حاصل کر جاتی ہے۔ یہاں ہر مقام پر موسیٰ، شعیبؑ، فرعون، سامری، قارون، ابراہیمؑ، آزر، سلیمانؑ، یوسفؑ، خضرؑ، الیاس، عیسیٰؑ، جبرئیلؑ، اسرافیلؑ، مصطفیٰؐ، بولہب، لات و منات، بلالؓ فاروقؓ، علیؓ، مرحب، عنتر، زہراؓ، بوذرؓ، سلمانؓ، اویسؓ، حسینؓ، سکندر مقدونی، دارا، جمشید، قیصر کسریٰ، نوشیروان عادل، اردشیر، خسرو پرویز، فغفور و خاقاں، چنگیز، طغرل، سلیم، سنجر، محمود، ایاز، جنید، عطار، رومی، فارابی، بوعلی سینا، رازی، غزالی، لیلیٰ، مجنوں، شیریں، فرہاد، سکندر ذوالقرنین، سعدیٰ، سلیمیٰ، بہزاد وغیرہ کی تاریخی و تلمیحی حیثیت کے ساتھ ساتھ علامتی معنویت بھی ہے جو نہایت منفرد، نادر اور معنی خیز ہے۔ خاص طور پر ان میں سے بعض تلمیحوں کا شمار تو بھرپور رمزی اوصاف کے باعث اقبال کی کلیدی علامات میں ہوتا ہے۔ علامہ کے تلمیحی علائم و رموز اس لحاظ سے بھی لائق ستائش ہیں کہ آفاقی خصائص کے حامل ہونے کے سبب ان کا اطلاع بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی اور مذہبی منظر نامے پر بہ آسانی کیا جا سکتا ہے، جو یقیناً نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

حوالے:

(۱) حاتم رامپوری، ڈاکٹر: ڈاکٹر اقبال آشنائی، پٹنہ دی آرٹ پریس سلطان گنج، ص ۱۷
(۲) اسلوب احمد انصاری: اقبال کی تیرہ نظمیں، نئی دہلی، غالب اکیڈمی، طبع اوّل، ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۸
(۳) تبسم کاشمیری، ڈاکٹر شعریاتِ اقبال، لاہور مکتبۂ عالیہ ۱۹۷۸ء، ص ۴۲
(۴) وقار عظیم، سید: غمِ فرہاد و عشرتِ پرویز (مضمون) مشمولہ اقبال، شاعر اور فلسفی، لاہور تصنیفات، ۱۹۶۷ء، ص ۹۶
(۵) عبدالمنان، ڈاکٹر رموزِ اقبال (مرتبہ) ظفر اوگانوی، کلکتہ: اقبال صدی تقریبات کمیٹی، کلکتہ یونی ورسٹی، طبع اوّل ۱۹۸۴ء، ص ۱۸۲۔۱۸۳

رابعہ سرفراز☆

اقبال کے اجتہادی تصورات

اقبال ایسے دور میں پیدا ہوئے جو مسلمانوں کے انحطاط اور پستی کا دور تھا۔ مایوسی اور بے یقینی کی کیفیات میں گھرے ہوئے مسلمان اسلام کی زندگی بخش تعلیمات سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اقوامِ مغرب کی مادی ترقی نے اہلِ اسلام کو مادیت پرستی کی طرف راغب کر دیا تھا۔

اقبال نے مغربی تمدن کی بنیادی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی بنیادی حقیقتوں کو واضح انداز میں پیش کیا۔ انھوں نے مسلمانوں پر یہ بات واضح کی کہ دنیا میں اسلام کو عروض حاصل ہوگا اور مسلمان اس دینِ حق کی بدولت دنیا کو مادی خواہشات اور حرص و ہوس کی ہولناکیوں سے بچانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اقبال کے فکری اور ذہنی ارتقا میں ان کے اجتہادی تصورات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کے اہم مسائل کے حوالے سے مختلف پہلوؤں کو دیانت داری، صداقت، مکمل خلوص اور ذہانت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا۔

انھوں نے بتایا کہ اسلام صرف انسانی اخلاق کی اصلاح کا داعی ہی نہیں بلکہ عالمِ اسلام کی اجتماعی زندگی میں ایک مسلسل، تدریجی اور اساسی انقلاب کی علامت بھی ہے۔ ایسا انقلاب جو ہمارے قومی اور نسلی نظریات کو بدل کر انسانی ضمیر کی تخلیق اور نشوونما کرے۔

وہ اصولِ توحید کو افراد کی ذہنی اور جذباتی زندگی میں ایک عملی اور زندہ اصول کی حیثیت میں کارفرما دیکھتے ہیں۔ یعنی افراد کو رنگ، نسل یا وطن کی وابستگی اور فرماں برداری سے بچتے ہوئے اللہ کی وابستگی اور فرماں برداری اختیار کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات اور زندگی کی روحانی بنیاد ہے۔ اس لیے اللہ سے وابستگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی بلند ترین خودی سے وابستہ ہو گیا ہے۔

اقبال اسلامی نقطۂ نظر سے کائنات کی حقیقتوں کو دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے وابستگی ایک حقیقتِ ازلی ہے جو ہر لمحہ نئے انداز سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہ ازلی اور ابدی حقیقت مختلف ادوار میں مختلف صورتوں میں منظرِ عام پر آتی ہے وہ ہیئتِ اجتماعیہ جو اس بنیادی اور ازلی حقیقت پر تعمیر ہوگی، پائیدار اور مستحکم ہوگی۔

☆اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونی ورسٹی، فیصل آباد

مثالی اجتماعی زندگی کے قیام کے لیے مضبوط اور پائیدار بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے اساسی اصول جو تمدنی زندگی کے تغیرات کی رہنمائی کرسکیں۔ استحکام اور تغیر کی ہم آہنگی کو ہر دور میں قائم رکھنے کے لیے اجتہاد اور اجتہادی تصورات نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

ابتدا میں اقبال نے اپنے زمانے کے حالات کے پیشِ نظر اجتہاد کے مقابلے میں تقلید کو ترجیح دی تھی جو اس دور کی مصلحت آمیز حکمت عملی تھی۔ لیکن بعد میں انھوں نے اپنا نقطۂ نظر تبدیل کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اگرچہ قومی شیرازہ بندی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن کسی بھی قوم کی زندگی کا دارومدار مادیت یا مصنوعی شیرازہ بندی پر نہیں ہوتا بلکہ اس سلسلے میں افراد کی ذہنی اور جسمانی نشوونما بہت اہم ہے۔

جب تک کسی قوم میں ایسے افراد نہیں ہوگے جو نہایت خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قوم کو نئے تصورات سے روشناس کرائیں، تمدن کی بدلتی ہوئی ضروریات سے ہم آہنگ کریں، مصنوعی پابندیوں سے بے نیاز ہوں، تب تک اس قوم کے لیے ارتقائی منازل کو طے کرنے کے کوئی امکانات نہیں۔

اقبال نے ''رموزِ بے خودی'' میں اسلامی معاشرے کے دو بنیادی ارکان کی تفصیل پیش کی ہے۔ پہلا رکن توحید ہے۔ جو اسلامی معاشرے کی بنیاد ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ ربانی ہے کہ اللہ نے تمام بنی نوع انسان کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اس بنیاد پر اسلام نے ایک ایسے وقت میں ایک عالمگیر انسانی برادری قائم کرنے کی کوشش کی جب دنیا اس تصور سے بالکل ناآشنا تھی۔ اس نے رنگ، نسل، زبان اور وطن کو نظر انداز کر دیا اور ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی جس کا دارومدار شرفِ انسانی پر ہے۔ جب تک انسان عملی اعتبار سے اس اصول کا قائل نہیں ہو جائے گا اُس وقت تک اس دنیا میں کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکے گا۔

اقبال مساوات، آزادی اور اخوت کو عقیدۂ توحید کے مضمرات قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ان اصولوں کو ایک زندہ حقیقت بنا کر دکھائے۔ عقیدۂ توحید کی رو سے کائنات کی اصلی حقیقت روحانی ہے۔ یہی روحانی حقیقت زمانی افعال میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ لہٰذا کوئی بھی اسلامی مملکت کسی طرح بھی لادینی ریاست نہیں بن سکتی۔

اقبال کے افکار کے مطابق ہر وہ دائرۂ عمل و فعل، جو بظاہر دین سے متعلق نہ ہو، اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسی طرح پاکیزہ اور روحانی ہے جس طرح خالص دینی دائرۂ فعل و عمل۔ اسلام کی رو سے، دین اور لادین کی تقسیم غیر فطری اور موجب فساد ہے۔ کائنات کی غیر محدود فضا انسانی ارتقا کے لیے ایک وسیع میدان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ یہ ایک مقدس مسجد ہے جس کے ہر کونے میں خدائے واحد کا نام بلند کرنا ہے... یعنی معاشرے کو تمام غیر فطری امتیازات سے پاک کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

یہ ایسا عالمگیر تصورِ حیات ہے جس کے بغیر کوئی معاشرہ اسلامی نہیں کہلا سکتا۔

اقبال نے ''رموزِ بے خودی'' میں اسلامی معاشرے کی زمانی ابدیت کے سلسلے میں رسول کریمؐ کی ختم نبوت کو بنیادی اور اہم عقیدہ قرار دیا ہے۔ اپنے پانچویں خطبے ''اسلامی کلچر کی روح'' میں اقبال نے نبوت کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے مسئلہ ختم نبوت کو

موضوعِ بحث بناتے ہوئے رسولِ کریمؐ کی ذات مبارکہ کو قدیم اور جدید ادوار کا سنگم قرار دیا ہے۔

اقبال ختم نبوت کے عقیدے کو اسلامی تعلیمات کا اہم جزو تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے ختم نبوت کی ثقافتی اہمیت کو بہت دل نشین انداز میں بیان کیا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ شعورِ نبوت دراصل وہ شعور ہے جو اپنی حدود سے متجاوز ہو کر ثقافتی زندگی کی تشکیل جدید کے لیے نئے نئے مواقع تلاش کرتا رہتا ہے۔ ختم نبوت کے نظریے نے انسانوں پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانیت کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ تاکہ انسان ہمیشہ کے لیے نبوت کا محتاج نہ رہے۔ باطنی واردات اور مشاہدات کے علاوہ مطالعۂ تاریخ اور مشاہدۂ فطرت حصولِ علم کے سرچشموں کی حیثیت سے ختم نبوت کے تصور کے مختلف پہلو ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہبی وجدان اور مکاشفات کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ اپنی نشانیوں کو نہ صرف ہمارے باطن بلکہ ہمارے خارج پر بھی منکشف کرتا ہے۔ مطالعۂ فطرت کے بغیر تسخیرِ کائنات کا عمل ناممکن ہو جاتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ:

> ''باطنی مشاہدہ تو انسانی علم کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ قرآن کی رُو سے علم کے دو اور ذرائع ہیں یعنی فطرت اور تاریخ۔''(۱)

اقبال اجتہاد کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اجتہاد کی طرف توجہ دینی چاہیے ورنہ قرآن کی تعلیمات ہمارے زمانے کے لیے بے کار ثابت ہوگی۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان کے دل کی گہرائیوں میں خالقِ کائنات اور کائنات سے تعلق کا صحیح تصور جاگزیں ہو جائے۔

اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں قرآنی نظامِ حکومت کا مختصر نقشہ پیش کیا ہے۔ انھیں کامل یقین ہے کہ قرآن اب بھی ایک نئے نظامِ حکومت کی بنیاد رکھنے کے لیے تیار ہے۔ بشرطیکہ نہایت توجہ اور دل کی گہرائیوں سے اس کا مطالعہ کیا جائے۔

نقش قرآں تا دریں عالم نشست
نقش ہائے کاہن و پا یا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے بے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اقبال کی رائے میں:

> ''قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال (مسئلہ اجتہاد) پیدا ہونے والا ہے

مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔'' (۲)

اقبال کی رائے میں جو شخص قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس (Jurisprudence) یعنی اصول فقہ پر تنقیدی نگاہ ڈال کر قرآنی احکام کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدّد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم ہوگا۔

ارتقائی نظریہ قرآن کے بنیادی عقائد کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اجتہاد کا دوسرا ماخذ حدیث ہے۔ یعنی رسول اکرمؐ کے تمام اقوال و افعال اور دوسروں کے وہ اعمال جن کو آپؐ نے قائم اور برقرار رکھا۔ اجتہاد کا تیسرا ماخذ اجتماع ہے۔ اس بارے میں اقبال کا کہنا ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد بنی اُمیہ اور بنی عباس نے جو ملوکیت قائم کی، اس کے مفاد کے لیے یہ ضروری تھا کہ اجتہاد کا منصب کسی فردِ واحد کی بجائے کسی مستقل قانون ساز اجماعی ادارے کے سپرد کیا جاتا۔ مسلمان ملکوں میں ملوکیت کے خلاف جذبہ پرورش پا رہا ہے اور مختلف مقامات پر قانون ساز مجالس قائم ہیں۔ موجودہ حالات میں اگر اجتہاد کا کام افراد کی بجائے ان مجالس کے سپرد کر دیا جائے تو یقیناً ہمارے قانون کے ارتقا کا باعث ہوگا۔

کسی قانون کے کتاب و سنت کے موافق یا مخالف ہونے کے فیصلے کے بارے میں اقبال کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں جب مسلمان ممبران مجالس اسلامی قوانین سے مکمل طور پر واقف نہیں ہیں، اس اہم سوال کا جواب ان ممبران پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کا صحیح حل یہی ہے کہ موجودہ قانونی تعلیم کی اصلاح کی جائے اور اسے زمانۂ حال کی روح سے تطبیق دی جائے۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ اس قسم کے تمام فیصلے کی عدالتِ عالیہ کے سپرد کر دیے جائیں۔

اجتہاد کا چوتھا اور آخری ماخذ قیاس ہے۔ اسلامی فقہ کی تاریخ میں حنفی فقہ قیاس اور رائے کے لیے مشہور ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ نئے حالات کے مطابق اسلامی قوانین کی تشکیل میں کسی قسم کی دشواری نہیں۔ اسلامی معاشرے کی بنیاد توحید اور ختمِ نبوت کے عقیدوں میں مضمر ہے۔ اقبال تین چیزوں کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیتے ہیں، کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کی روحانی آزادی اور وہ عالمگیر بنیادی اصول جو افراد کے اخلاقی اور روحانی ارتقا کے لیے سنگ میل کا کام دے سکیں۔

عقل، محض کی بنیاد پر قائم کردہ حقائق انسانی افراد میں ایمان اور یقین کی وہ مشعل روشن نہیں کر سکتے جو وحی الٰہی نے پیغمبروں کے ذریعے کی۔ اقبال نے دلائل سے واضح کیا کہ فلسفہ انسانی زندگی میں وہ انقلاب پیدا نہ کر سکا جو جو مذہبی تعلیمات سے رونما ہوا۔ فرنگی ماحول انسانیت کے اخلاقی ارتقا کے راستے کی زبردست رکاوٹ ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے پاس وحی الٰہی کی وساطت سے یہ تمام حقائق موجود ہیں۔ اسلام ایک عالمگیر اور آخری دین ہے جس میں یہ تینوں صداقتیں موجود ہیں۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ان اصولوں کو عملی جامہ پہنا کر اس مادی دنیا میں صحیح روحانی زندگی کی تشکیل کریں۔

اقبال کائنات کی اصل کو روحانی قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مادی جوہر بھی خدائی فعلیت کا مظہر ہے لیکن وہ موجود ہو کر مکانی نظر آتا ہے۔ اسی طرح اقبال روح کو بھی اسی خدائی صفت کی حامل لیکن جسم کو اس کی مرئی اور قابلِ پیمائش شکل قرار دیتے ہیں۔

اقبال نیکی کے لیے آزادیٔ عمل کو ضروری قرار دیتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ جس ہستی کی حرکات وسکنات مکمل طور پر مشین کی طرح ہوں، وہ نیکی کے کام نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ نیکی کے لیے آزادی بنیادی شرط ہے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ جس طرح فلسفے کا مقصد علم حاصل کرنا ہے بالکل اسی طرح دعا حصولِ علم کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ دعا یا ذکر کو فکر سے بلند قرار دیتے ہیں۔

اسلامی فقہ کی حرکت پذیری، اسلام کی آفاقی تعلیمات اور اسلامی آئین کے چار اہم اور بنیادی ماخذوں کے ذکر اور مذہب اور فلسفے کے تقابلی جائزہ میں مذہب کو فلسفہ پر ترجیح دیتے ہوئے اقبال نے اپنے اجتہادی تصورات پر مکمل روشنی ڈالی ہے اور مدلّل انداز میں اسلام کی تشکیلِ جدید کا تصور پیش کیا ہے۔

حوالہ جات

۱) محمد شریف بقا: خطبات اقبال ایک جائزہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۹۹
۲) گوہر نوشاہی (مرتبہ)، مطالعۂ اقبال، بزمِ اقبال لاہور ۱۹۸۳ء، ص ۲۶۳

کتابیات

جاوید اقبال: زندہ رود، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۸۹ء
گوہر نوشاہی (مرتبہ)، مطالعۂ اقبال، بزمِ اقبال لاہور ۱۹۸۳ء
محمد عبداللہ قریشی، روحِ مکاتیبِ اقبال، اقبال اکادمی (پاکستان) لاہور، ۱۹۷۷ء
محمد شریف بقا: خطبات اقبال ایک جائزہ، اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۹۱ء

عظمیٰ عزیز خاں☆

مثنوی ''پس چہ باید کرد ای اقوام شرق'' تعارف و اہمیت

حکیم الامت، شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؒ کی شعری تخلیقات کا پچپن فی صد حصہ فارسی میں ہے۔(۱) ان کے فارسی کلام کا تقریباً ستر فی صد حصہ مثنوی کی صنف سخن میں ہے اور ان مثنویوں میں سے اسرار خودی، رموز بے خودی، بندگی نامہ، جاوید نامہ، مسافر اور پس چہ باید کرد ای اقوام شرق جیسی اہم مثنویاں اقبال کے مرشد معنوی مولانا جلال الدینؒ [م: ۱۲۷۳ء] کی شہرۂ آفاق مثنوی معنوی کی بحر(۲) میں لکھی گئی ہیں۔(۳) مثنوی کی ہیئت داستانوی اور اخلاقی و تربیتی موضوعات کے بیان کے لیے موزوں ترین سمجھی جاتی ہے،(۴) یہی وجہ ہے کہ ان تمام عظیم شعرا نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اسی صنف سخن کو ترجیح دی ہے جن کے پیش نظر کسی برتر انسانی و اخلاقی پیغام کا ابلاغ مقصود تھا۔ اقبالؒ کے فارسی شعری سرمائے میں بھی اس صنف سخن کی کثرت کا یہی سبب ہے کہ ان کے نزدیک اپنے احیائے ملّت کے مبسوط اور مربوط منشور کی پیش کش کے لیے مثنوی سے بہتر اور کوئی صنف سخن نہیں ہو سکتی تھی۔

مثنوی پس چہ باید کرد ای اقوام شرق کا شمار بجا طور پر اقبالؒ کی اہم ترین مثنویوں میں ہوتا ہے۔ یہ وہ مثنوی ہے جس میں اقبالؒ کی فکریات کا اختصار اور جامعیت کے ساتھ بھرپور اظہار اور ابلاغ ہوا ہے۔ اس کی معنوی اہمیت و افادیت کے ساتھ ساتھ اس کی ایک ظاہری انفرادیت بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ اقبالؒ کے ذخیرۂ کلام میں یہ واحد شعری مجموعہ ہے جس کا نام ایک پورے مصرعے پر مشتمل ہے جب کہ دیگر تصانیف کے نام دو لفظی تراکیب سے عبارت ہیں۔

مثنوی پس چہ باید کرد کا سبب تالیف اقبال کا وہ خواب ہے جو انھوں نے ۳/اپریل ۱۹۳۶ء کو بھوپال میں دیکھا جہاں وہ بہ غرض علاج گئے تھے۔ اس خواب میں ان کی ملاقات سرسید احمد خان [۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء] سے ہوئی جنھوں نے اقبال سے کہا کہ وہ بارگاہ رسالتؐ میں اپنی بیماری کا ماجرا پیش کر کے استغاثہ کریں۔ اقبال خواب سے بیدار ہوئے تو یہ شعر ان کی زبان پر جاری تھا:

با پرستاران شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز(۵)

یہاں یہ بات خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اکابر امت میں ایسے استغاثے کی روایت رائج رہی ہے کہ کسی شدید تکلیف یا

☆ ریسرچ اسکالر سید علی ہجویریؒ، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

بیماری میں نبی کریمؐ کی بارگاہ اقدس میں مدعا پیش کیا جائے آپؐ کے وسیلے سے، اللہ تعالیٰ سے صحت وسلامتی کی دعا کی جائے۔ اس کی مشہورترین مثال امام شرف الدین بوصیریؒ [م:۱۲۹۵ء] کا شہرۂ آفاق قصیدۂ بردہ ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کے منظوم ومنثور تراجم اور شرحیں موجود ہیں۔(۶)

اقبال اپنے اس خواب اور مثنوی پس چہ باید کرد کے حوالے سے سرراس مسعود کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''۳/اپریل کی شب کو، جب مَیں بھوپال میں تھا، مَیں نے تمھارے دادا رحمتہ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ مجھ کو فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرا! میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرض داشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل ساٹھ شعر ہوئے۔ لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے، اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہے۔ الحمدللہ کہ یہ مثنوی بھی اب ختم ہو گئی ہے۔ مجھ کو اس مثنوی کا گمان بھی نہ تھا۔ بہرحال اس کا نام ہوگا:

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق''(۷)

یہ مثنوی اقبال نے اپنی وفات [۱۹۳۸ء] سے دو برس پہلے [۱۹۳۶ء میں] لکھی تھی، چناں چہ اسے فکری وفنی لحاظ سے ان کی معراج کمال قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس دور میں ان کے افکار ونظریات پختگی کے اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا امکان نہ تھا۔ عالم اسلام کی مجموعی زبوں حالی، مسلمانانِ ہند کی بے بسی اور مغرب کی ریشہ دوانی اقبال پر روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی اور مسلمانوں کی اصلاح احوال اور ان کے سربلند حال اور مستقبل کے سلسلے میں اقبال کے خواب، خواہشیں، آرزوئیں اور مقاصد کامل طور پر تشکیل پا چکے تھے۔ اسی لیے اس مثنوی کی بُنت میں اختصار وایجاز اور اس کے لب ولہجے میں فیصلہ کن اسلوب ہے جیسے کوئی دیدہ ور سپہ سالار اپنی فوج کو قطعی اور حتمی حکم دے رہا ہو۔ اس اعتبار سے یہ مثنوی فکر اقبال کی پرمعنی تلخیص بھی کہلا سکتی ہے۔ اسی غیرمعمولی اہمیت کے پیش نظر اقبال شناسی کے میدان میں اس کا مطالعہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے بقول:

''مَیں اس کتاب کے بست سالہ مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جن لوگوں کے پاس اقبال کی تمام تصانیف کے مطالعے کے لیے وقت نہیں ہے، وہ صرف اس کتاب کے مطالعے سے ان کے تمام بنیادی افکار سے واقف ہو سکتے ہیں۔''(۸)

مثنوی پس چہ باید پہلی بار لاہور سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔(۹) علامہ اقبال ۱۱/جون ۱۹۳۶ء کو عبدالوحید خان کے نام مرقومہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''...ضربِ کلیم کے بعد ایک فارسی مثنوی پس چہ باید کرد ای اقوام شرق شائع ہوگئی۔''(۱۰)

مثنوی کی پہلی اشاعت بڑی تقطیع (۲۱×۱۷ س م) پر تھی اس کا کاغذ مضبوط اور پائیدار تھا۔ کتابت نسبتاً باریک تھی۔ ہر صفحے پر

دس سطریں تھیں۔ اس کی کتابت اور مثنوی مسافر کی کتابت ایک ہی کاتب کی ہے۔(۱۱) اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اس اشاعت میں مشترکہ سرورق کے علاوہ پہلی بار پس چہ باید کرد اور مثنوی مسافر کا اندرونی سرورق الگ الگ لگایا گیا تھا۔ بعد کی تمام تر اشاعتوں میں تاحال یہ صورت ہے کہ دونوں مثنویاں یکجا شائع ہوتی ہیں۔ سرورق پر پہلا نام بس چہ باید کرد کا ہوتا ہے اور پھر مسافر کا۔(۱۲) کلام اقبال کی زمانے ترتیب کے مطابق مثنوی مسافر پہلے کی تخلیق ہے۔(۱۳) اور پس چہ باید کرد اس سے موخر ہے۔ موجدہ مطبوعہ صورت میں دونوں مثنویوں کی تقدیم و تاخیر پر بعض ماہرین اقبالیات نے عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ کیا ہی اچھی ہوتا کہ یکجا اشاعتوں میں مثنوی مسافر کو مقدم رکھا جاتا ہے۔ مثنوی پس چہ باید کرد چودہ ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ اگر چہ ایک شخصی واقعہ یعنی اقبال کی علالت طبع اور ایک خواب اس کا سبب تصنیف بنا اور اس کا آغاز محض ذاتی احساسات کی ترجمانی سے ہوا لیکن اس کا موضوعاتی پھیلاؤ تدریجاً اتنی وسعت اختیار کرتا چلا گیا کہ اس کے لیے برصغیر کی وسیع و عریض جغرافیائی حدود بھی کم پڑ گئیں اور آہستہ آہستہ پورا عالم اسلام اس کا موضوع بن گیا اور جہاں مشرق کی تمام اقوام اس پیغام مخاطب قرار پائیں۔ اقبال اپنی جسمانی علالت اور روز افزوں نقاہت سے بہت پریشان تھے لیکن اس سے کہیں بڑھ کر وہ اقوام مشرق کی گرتی ہوئی روحانی و اخلاقی صحت و سلامتی سے دل گرفتہ تھے۔ اسی نا آسودگی کی بنا پر بارگاہ رسالت میں عرض حال کے طور پر پیش کیے جانے والے اشعار نے ایک مستقل مثنوی کی شکل اختیار کر لی(۱۴) اور اس میں انھوں نے اپنے ذاتی عوارض کے بیان کی بجائے امت مسلمہ کو لاحق اجتماعی عوارض کی زیادہ نشاندہی کی:

"Masnavi Pas Chih Bayad Kard contains Iqbal's prescription for the down-trodden Eastern nations to rid themselves of the yoke of colonialism in which he also highlights the plight and powerlessness of the muslims."(15)

مثنوی پس چہ باید کرد کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اقبال کا روئے سخن محض کسی فرد واحد یا ایک قوم کی طرف نہیں بلکہ ان کا خطاب پورے عالم مشرق سے ہے۔ وہی مشرق جو سورج کے طلوع کا امین ہے، روشنیوں کا گہوارہ ہے، اجالوں کا سرچشمہ ہے لیکن مغرب کی حیلہ گری اور افسوں طرازی نے اسے اندھیروں کی سرزمین بنا دیا ہے۔ اب اس کی کوکھ سے جہالت اور پس ماندگی کی تاریکی جنم لیتی ہے اور اس پر غلامی کی گہری کالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ اقبال نباض مشرق و مغرب ہیں، دونوں کے رازداں ہیں۔ وہ اہل مشرق کو ان کے تشخص کا احساس دلاتے ہیں اور انھیں مغرب کی ان سازشوں سے خبردار کرتے ہیں جن کی وجہ سے مشرق کا حسن و جمال گہنا گیا ہے اور اس کی رونقیں ماند پڑ گئیں۔ یہ مثنوی اقبال کی عمر بھر کی ریاضت کا نچوڑ اور ان کے افکار کا خلاصہ ہے۔(۱۶)

ایسے حساس موضوع کے ابلاغ کے لیے اقبال جیسے بابصیرت مصلح نے بڑا حکیمانہ انداز اپنایا ہے ڈاکٹر شہین مقدم صفیاری اس کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتی ہیں:

''اقبال در سخنِ خود دربارۂ شرق مستقیم و بلاواسطہ بہ توصیف یا توبیخ نمی پردازد بلکہ اول نقشِ سازندۂ آن شرقِ روشنگر را یاد آوری می شود و سپس بہ مظلومی و محکومی و بی سیاسیِ شرقیان اشارہ می کند و نظریاتِ خود را بہ اجمال بیان می کند و آنگاہ بہ پیام ہای ناصحانۂ خود خطاب بہ شرق و غرب اقدام می نماید۔''(۱۷)

ترجمہ: ''اقبال مشرق کے بارے میں اپنے کلام میں براہِ راست تعریف وتوصیف یا تنبیہ وتوبیخ کا انداز اختیار نہیں کرتے بلکہ پہلے اُجلے مشرق کی مظلومی، غلامی اور ان میں سیاسی بصیرت کے فقدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اختصار سے اپنے خیالات بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد مشرق و مغرب کے نام اپنا ناصحانہ پیغام دیتے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ مثنوی پس چہ باید کرد میں اقبال کی اختیار کردہ یہ حکیمانہ روش عروج پر نظر آتی ہے یہی وجہ ہے اس کا جوش بیان اور تاثیر کلام غیر معمولی حد تک زیادہ ہے۔ اسی لیے اس مثنوی کو اقبال کی شاعری کا دھڑکتا ہوا دل قرار دیا جاتا ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے ایک بار علامہ قبال سے کہا کہ آپ کی شاعری جسم ہے اور مثنوی پس چہ باید کرد اس کا دل۔ موصوف کا بیان ہے کہ میری اس بات پر علامہ یوں مسکرا دیے جیسے کسی نے دل کی بات کہہ دی ہو۔(۱۸)

اقبال کا عہد مسلمانوں کے ہمہ گیر زوال کا دور تھا۔ مسلمانوں کا شاندار ماضی قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ تمام اسلامی سرزمینیں اغیار کے ظاہری یا مخفی نرغے میں تھیں۔ برصغیر کے مسلمان برطانوی استعمار اور ہندو استبداد کا شکار ہو کر پستی کی آخری منزل تک پہنچ چکے تھے۔ سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر مسلمانوں کو شدید شکست وریخت کا سامنا تھا اور ان کا تشخص ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ دنیائے جدید کے تمدن کے مقابلے میں ان کی خود سپردگی شرمناک حد تک پہنچ گئی تھی اور ان کی شناخت داؤ پر لگ چکی تھی۔(۱۹) ایسی ناگفتہ بہ صورت حال میں ضرورت تھی کہ مسلمانوں کو ان امور کا احساس دلایا جائے۔ انھیں روح عصر سے آگاہ کیا جائے۔ ان کا حوصلہ بڑھایا جائے تاکہ وہ عملی زندگی میں سربلندی کی طرف پیش قدمی جاری رکھ سکیں۔(۲۰)

اقبال نے مسلمانوں کو خدا اور اسلام سے پیوستہ رہ کر اپنے مقام اور عصری مسائل کے ادراک کا درس دیا۔ انھوں نے تمام مرد و زن کو عزت نفس، خودی، آزادی اور جدوجہد سے آشنا کیا۔ کیوں کہ یہی وہ راستہ تھا جس پر چل کر وہ آزادی کی نعمت حاصل کر سکتے تھے(۲۱) اور دنیا میں اپنا جائز مقام حاصل کر سکتے تھے۔ یہ مثنوی اسی نسخۂ کیمیا پر مشتمل ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے بقول:

''اس مثنوی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ انھوں نے اقوام مشرق کو اس طریق کار سے آگاہ کیا ہے جس کی بدولت وہ فرنگ کے تسلط سے رہائی حاصل کر سکتی ہیں۔''(۲۲)

اقبال کے ذہنی نبوغ اور فکری بصیرت کا جائزہ لیا جائے تو پوری قطعیت سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے فکر و خیال کا ہر زاویہ اسلام سے گہری وابستگی سے مربوط تھا اور وہ انسانیت اور اسلام کو لاحق خطرات سے بروقت خبردار ہو جاتے تھے اور فرض شناس قائد کی طرح مظلوموں کو ان خطروں سے آگاہ کرتے تھے۔ اقبال کا یہ عظیم کارنامہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی کے بقول:

"Iqbal exposed the machinations of western imperialists and warned the East of their treacherous moves to exploit the Muslims and other backward countries."(23)

دور جدید میں اقبال شاید پہلے مسلمان مفکر تھے جنھوں نے مغرب کی قومیت پرستی اور اسلامی دنیا پر اس کے مضر اثرات کو اتنی

شدت سے محسوس کیا اور کثرت سے اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا اہل مشرق کو مغرب کی اندھی تقلید سے روکا اور اس کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی چال بازی سے آگاہ رہنے کی تاکید کی۔ مثنوی پس چہ باید کرد کے بارے میں بی اے ڈار نے لکھا ہے:

"The present mathnavi is, therefore adderssed to the people of East. In the introduction, he warns the readers of the reason's revolt which may endanger the future of the human race."(24)

اقبال کو اس ضمن میں مکمل طور پر شرح صدر حاصل تھا کہ اسلام میں مذہب اور سیاست کے مابین کوئی مغائرت نہیں ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست کا معتدل اور متوازن امتزاج ہی منتہائے مقصود ہے اور دین ان دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ سیاست اگر دین سے منحرف ہو جائے تو محض فتنۂ چنگیز کی یاد ہی تازہ کرتی ہے۔ دین سیاست کی ڈھال ہے جو عوام الناس کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔ حق و باطل میں فاصلہ قائم رکھتی ہے۔ پس چہ باید کرد میں اسی حوالے سے دین و سیاست کے اسرار و رموز بڑی وضاحت و صراحت سے بیان کیے گئے ہیں۔(۲۵)

پس چہ باید کرد استعمار اور لادینیت کے خلاف اعلان جہاد ہے۔ اس اعتبار سے یہ ضربِ کلیم کی سی معنویت کی حامل ہے۔(۲۶)

یہ مثنوی مشرقیات کے میدان میں ایک برتر فکری سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں انھی حقائق کی نشاندہی کی گئی ہے جو سید جمال الدین افغانی [۱۸۳۹ء - ۱۸۹۷ء] مصر کے محمد عبدہ [۱۸۴۹-۱۹۰۵ء] اور معاصر عہد کے نامور دانشور ایڈورڈ سعید جیسے عظیم اہل بصیرت نے محسوس کیے اور اپنے اسلوب میں ان کی پردہ کشائی بھی کی۔

پس چہ باید کرد میں کی جانے والی تجدید و احیاء کی کوشش وقت کے اہم ترین تقاضے پر درد دل رکھنے والے ایک مفکر کی لبیک ہے جسے بہترین شاعرانہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ علامہ نے پیام مشرق کے دیباچے میں خود بھی ایسی ہر کوشش کو مستحسن قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابل احترام ہے۔''(۲۷)

مثنوی پس چہ باید کرد کی شعری عظمت بھی اقبال کے دیگر کلام سے کمتر نہیں ہے۔ چوں کہ اس میں زیادہ سے زیادہ ابلاغ پیش نظر تھا اس لیے اس کی زبان آسان و رواں ہے لیکن یہ سادگی بھی تہ دار اور پرکار ہے۔ لفظی و معنوی صنائع و بدائع کا کم سے کم استعمال کیا گیا ہے۔ تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کی فراوانی ہے لیکن اس سے زبان کی سلاست اور کلام کی روح قطعاً متاثر نہیں ہوئی۔

علامہ کی اس مثنوی کو ان کا ایک نہایت اہم شعری کارنامہ سمجھا جانا چاہیے اور یہ اسی بنا پر کہ اس کے ذریعے انھوں نے اپنا فلسفہ، اپنا نظریہ اور اپنا پیغام بڑی سادگی سے مگر بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ یہ سادگی ایسی سادگی ہے جو دنیائے ادب میں معجزہ فن

کی حیثیت رکھتی ہے۔(۲۸)

پس چہ باید کرد کے موضوع سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر عبدالشکور احسن [۱۹۱۶-۲۰۰۷ء] تحریر کرتے ہیں:

''پس چہ باید کرد میں نئے دور میں عالم مشرق کی اُبھرتی ہوئی تقدیر کی نوید ہے اور مشرقی اقوام کو مغرب کی ظالمانہ مگر انحطاط پذیر استعمار گری کے خلاف نبرد آزما ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس مثنوی میں برصغیر کے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر یہاں ایک نیا وطن بنانے کی تلقین بھی کی گئی ہے اور حصول پاکستان کے ضمن میں معنی خیز اشارے ملتے ہیں۔''(۲۹)

معروف ایرانی ماہر اقبالیات ڈاکٹر شہین مقدم صفیاری کے لفظوں میں:

''اقبال نے اس مثنوی میں مشرق کو حرکت و عمل اور مبارزت کا درس دیا ہے، مشرقی اقوام کو مغرب کے حیلہ و فریب سے خبردار کیا ہے اور استعماری سیاست کا اعلیٰ انسانی اور اسلامی حکومت سے تقابل کیا ہے۔''(۳۰)

کوریا کے اقبال شناس ڈاکٹر گیوساب شین (Gyu Seob Shin) کے بقول:

''اس مثنوی میں اقبال نے اقوام مشرق کو حقیقی فقر و درویشی کا راستہ دکھایا ہے۔ یہی مصطفائی فقر انھیں پستی اور زبونی سے نجات دلا سکتا ہے۔''(۳۱)

کلام اقبال میں ایک معنوی تسلسل اور فکری وحدت محسوس کی جا سکتی ہے ان کے بنیادی موضوعات ان کے کلام میں اوّل سے آخر تک جاری و ساری نظر آتے ہیں لیکن اسلوب بیان اور پیرایۂ پیش کش بہ ہر طور متنوع ہے۔ کلام اقبال میں فکری تسلسل اور معنوی مماثلت کی بہت بڑی مثال اسرار و رموز [۱۹۲۳ء] اور پس چہ باید کرد کی ہم آہنگی ہے۔ موخرالذکر مثنوی پہلی مثنوی کی صدائے بازگشت لگتی ہے۔(۳۲) فرق صرف اتنا ہے کہ اسرار و رموز میں فلسفۂ حیات کا بیان ہے جب کہ پس چہ باید کرد میں مشرق کی زبوں حالی، مغربی چیرہ دستی سے بچنے کی حکمت عملی اور اقوام مشرق کی حیثیت میں اپنے مستقبل کی بہتری کا منشور دیا گیا ہے۔ گویا اس مثنوی میں اقبال نے ملّی جہت کو واضح کر دیا ہے۔

اقبال کو تصوف اور روحانیت سے جو لگاؤ تھا اس کا اظہار ان کی ہر تحریر سے ہوتا ہے۔ پس چہ باید کرد میں بھی عرفان و روحانیت کی ذوق افروز لہریں موجزن ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی اسلامی ذہنی ساخت کی بنا پر کلام کو آیات و احادیث، اقوال اور ضرب الامثال سے بھی مزین کرتے ہیں اور یہ سارا عمل کامل طور پر فن کارانہ بے ساختگی سے رو پذیر ہوتا ہے۔ اس مثنوی میں بھی یہی روش کارفرما ہے۔ اقبال نے اہل مشرق کے لیے جو عالمی لائحہ عمل پیش کیا ہے اس کی بنیاد مستند اسلامی فکریات پر رکھی گئی ہے اور اس کے بیان کا آہنگ جوش و خروش اور سوز و گداز سے معمور ہے۔ یہی خصوصیات اقبال کے مرشد کامل رومی کی مثنوی معنوی کا طرۂ امتیاز بھی ہیں۔ یہ مثنوی پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ گویا یہ سورۂ اخلاص کی منظوم فارسی تفسیر ہے۔(۳۳) جسے کسی عالم و عارف نے زیور نظم سے آراستہ کیا ہے۔

علامہ نے ۱۷/۱کتوبر ۱۹۳۶ء کو خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں لکھا:

''میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا جس کی تشریح مَیں نے ان تحریروں میں جابجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔'' (۳۴)

حواشی:

(۱) سہیل عمر، محمد، ہرچہ گوید دیدہ گوید: اہمیت شعر حکیمانہ، اقبال از دیدگاہ نظریہ منتی شعر، مترجم ڈکتر آفتاب اصغر، لاہور، اکادمی پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص ۲۷

(۲) بحر رمل مسدس محذوف۔

(۳) اکرام، سید محمد اکرم ڈاکٹر، اقبال ایک تحریک، لاہور، شعبۂ اقبال پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۹

(۴) سیروس شمیسا، انواع ادبی، تہران، انتشارات فردوس، ۱۳۴۳ش، ص ۲۸۶

(۵) اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت ششم، ۱۹۹۰ء، ص ۸۴۷

(۶) دیکھیے:

ضیغم، سید سبط الحسن، قصیدہ بردہ شریف، لاہور پیکجز لمیٹڈ، ۲۰۰۲ء۔

(۷) اقبال، اقبال نامہ، جلد اوّل، مرتبہ عطاءاللہ، لاہور شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۴۵ء، ص ۳۱

(۸) چشتی، یوسف سلیم، پروفیسر، شرح مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر، لاہور مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۸۲ء، ص ۱۵۳

(۹) رفیق خاور، اقبال کا فارسی کلام ایک مطالعہ، لاہور، بزم اقبال، طبع اوّل، ۱۹۸۸ء، ص ۱۷

(۱۰) اقبال، کلیات مکاتیب اقبال، ج چہارم، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۲۱

(۱۱) ہاشمی، رفیع الدین، ڈاکٹر تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، لاہور اقبال اکادمی پاکستان، طبع دوم، ۲۰۰۱ء، ص ۱۶۳

(۱۲) ہاشمی، رفیع الدین، ڈاکٹر، تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، طبع دوم، ۲۰۰۱ء، ص ۱۶۵

(۱۳) میرزا ادیب، مطالعہ اقبال کے چند پہلو، لاہور، بزم اقبال، طبع اول، ۱۹۸۵ء، ص ۱۷

(۱۴) ندوی، عبدالسلام، تصانیف اقبال، مشمولہ فکر و فن اقبال، مرتبہ شگفتہ ریاض، لاہور سنگت پبلشرز، ۲۰۰۴ء، ص ۴۱

(15) Muhammad Ashraf, The Muslim Ummah and Iqbal, Islamabad, National Institute of Historical and Cultural Research, 1st edit, 1994, p 11.

(۱۶) چشتی، یوسف سلیم، شرح مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر، ص ۱۴۹

(۱۷) صفیاری، شہین مقدم، شرق و غرب در کلام اقبال، لاہور اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۹۹ء، ص ا

(۱۸) وحید الدین، فقیر سید روزگار فقیر، لاہور مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۸۷ء، ص ۱۸۴۔۱۸۵

(۱۹) صفیاری شہین مقدم، شرق و غرب در کلام اقبال، ص ۱۲۴

(۲۰) قریشی، سمیع اللہ، پروفیسر، موضوعات فکر اقبال، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، طبع اوّل ۱۹۹۶ء، ص ۳۳

(۲۱) قریشی، اکبر حسین، ڈاکٹر، مطالعہ تعلیمات و اشارات اقبال، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶ء، ص ۲۵۲

(۲۲) چشتی، یوسف سلیم، شرح مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر، ص ۱۵۴

(23) Irfani. A. Hamid, The Sayings of Rumi and Iqbal, Sialkot, Bazm-e-Rumi, 1976, p.53

(24) Dar, B.A, What Should be Done O People of the East, Lahore, Iqbal Academey Pakistan, 1st edit, 1977, pvii.

(۲۵) نگہت پروین، مثنوی پس چہ باید کرد ای اقوام شرق مع مسافر، فکری و فنی جائزہ، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اقبالیات، شعبۂ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۳

(۲۶) رفیق خاور، اقبال کا فارسی کلام ایک مطالعہ، ص ۷۰

(۲۷) اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۱۳

(۲۸) میرزا ادیب، مطالعۂ اقبال کے چند پہلو، ص ۱۲۳۔۱۲۴

(۲۹) احسن، عبدالشکور، پروفیسر، مقالات احسن، مرتبین آفتاب اصغر، معین نظامی، لاہور، شعبہ فارسی اورینٹل کالج، ۱۹۹۹ء، ص ۳۷۸

(۳۰) صفیاری، شہین مقدم، شرق و غرب در کلام اقبال، ص ۶۲

(۳۱) گیوساب شین، دکتر، شاعر شہیر شر، لاہور، شعبہ اقبالیات دانشگاہِ پنجاب، ۲۰۰۲ء، ص ۳۷

(۳۲) رفیق خاور، اقبال کا فارسی کلام ایک مطالعہ، ص ۷۲

(۳۳) جوناگڑھی، احمد اختر، میاں، قاضی، اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، طبع دوم، ۱۹۷۷ء میں ص ۱۶

(۳۴) اقبال، اقبال نامہ، ص ۳۱۹

سرسید احمد خاں، حالات و افکار

از: بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قیمت ۷۵ روپے

☆☆☆

افتخار شفیع☆

مقائسہ ارمغانِ حجاز، فارسی — اقبالیات میں ایک نئی تحقیق

کسی متن کے تحقیق کے دوران، اس کی تصحیح یا صحت خصوصی بے حد اہم تصور ہوتی ہے۔ اس کے بغیر نہ تو معتبر اور مستند تحقیق ممکن ہے اور نہ ہی صحت متن کے ساتھ کسی تحریر کی دریافت۔ الحاقی یا تبدیل کردہ مواد کی دریافت تمام دستیاب نسخوں کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔ تحقیق عمل کے دوران اصل متن کا حصول خاصا دقیق کام ہے۔ اصل متن کی بازیافت کو کاترے نے ''دانشِ انسانی کی ماہرانہ اور اور باضابطہ کارروائی'' قرار دیا ہے۔ اقبال کے عہدے سے پہلے کے نسخوں میں اختلاف نسخ معمولی بات ہے۔ کاتب حضرات کی غلطیاں یا اصلاحیں روزمرہ کا معمولی تھیں۔ مشرقی علوم میں کاتب / مدون حضرت کی ''خامہ خرابیوں کے لیے باقاعدہ طور پر ''تصحیف'' کی اصطلاح موجود رہی ہے۔ خطیب بغدادی کے ہاں ''کفایہ'' میں اس کی موجودگی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ پروفیسر سعید نفیسی کی مرتب کردہ ''کلیاتِ انوری'' میں سے غلطی سے دورِ التمش کے شاعر تاج الدین ریزہ کا کلام شامل ہو گیا۔ میرزا محمد رفیع سودا کی ''کلیات'' میں میر درد کے شاگرد امیر کی سو غزلیں ملحق ہوئیں۔ اسی طرح محمد حسین آزاد نے اپنے استاد ابراہیم ذوق کے دیوان میں بہت سے مقامات پر ترامیم اور اضافوں سے پیوندکاری کی ہے۔ امام بخش ناسخ کے شاگرد میر علی اوسط نے بھی اپنے استاد کے کلام کے ساتھ یہی برتاؤ کیا۔ عہد جدید میں بھی متن کا اختلاف معمول کی بات ہے، اہل علم و دانش اس حوالے سے مقائسہ (موازنہ یا مقابلہ) کے قائل ہیں۔

حضرت علامہ کی شخصیت ایک زمانے میں پورے برصغیر کے برابر تھی۔ لیکن آج کی مقبولیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی قدوقامت تو برصغیر سے ابھی اچھی خاصی بلند نکلی۔ ان کے فارسی کلام پاکستان، ایران، ہندوستان، افغانستان اور وسطی ایشیا کے باشندوں نے حرزِ جاں بنا رکھا ہے۔ ملکی اور ملکی جامعات میں اقبالیات کی عمومی تنقید و تحقیق کے لیے اقبال کی تصانیف پر معتبر اور گراں قدر سرمایہ موجود ہے۔ فارسی شاعری میں حضرتِ علامہ نے غیر معمولی دانش مندی اور کمال فن کا ثبوت دیا ہے، ان کا فارسی کلام اسرار خودی (۱۹۱۵ء)، رموزِ بے خودی (۱۹۱۸ء)، پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء)، زبورِ عجم (۱۹۲۷ء)، جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق مع مسافر (۱۹۳۶ء) اور ارمغانِ حجاز (۱۹۳۸ء) جیسی اہم

☆استاد شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، ساہیوال

شعری کتب پر مشتمل ہے۔ ارمغانِ حجاز کے علاوہ تمام کتب اقبال کی زندگی میں منظر عام پر آئیں۔ اقبال نے انھیں دیکھا، پڑھا اور مستند قرار دیا ہے، اس لیے صحت کے لحاظ سے یہ مقامِ استناد پر فائز ہیں۔ ارمغانِ حجاز، اقبال کی وفات (۱۹۳۸ء) سات ماہ بعد شائع ہوئی۔ اس لیے اس کا متن اقبالیات کے طالب علموں کو اکثر الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ ''ارمغانِ حجاز'' کا سب سے پہلا ایڈیشن حضرتِ علامہ کے دست راست چودھری محمد حسین نے ۱۸ر نومبر ۱۹۳۸ء میں شیخ محمد اشرف پرنٹرز لاہور سے شائع کروایا۔ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل یہ شعری مجموعہ اقبال کی علالت کے سبب ان کی توجہ سے محروم رہا۔ اس مجموعے میں شامل کچھ کلام زبانی تحریر کروایا گیا۔ بعض مصرعوں میں حضرت علامہ نے ترامیم بھی کروائیں۔ ایسے میں اس مجموعے کے متن میں خامیوں کا پیدا ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ اولین نسخے میں جو اسقام رہ گئے تھے بدقسمتی سے بعد میں شائع ہونے والے ایڈیشنوں میں ان کی درستی پر توجہ نہ کی گئی۔

خوش قسمتی سے ارمغانِ حجاز کی بیاض (اقبال کی اپنی دست نویس) محفوظ ہے۔ اولین نسخے اور قلمی بیاض میں ایک سے زاید جگہوں پر اختلاف موجود ہے۔ اس اختلاف کی کیا صورت ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے تمام مطبوعہ نسخوں کا قلمی بیاض سے موازنہ اشد ضروری تھا۔ یہ آسان کام نہ تھا، اس کے لیے شائع شدہ طباعتوں تک رسائی لازمی تھی۔ پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور، شعبہ اردو کی استاد اور محقق، محترمہ پروفیسر ڈاکٹر بصیرہ عنبرین نے یہ کام اپنے ذمے لیا۔ ڈاکٹر بصیرہ عنبرین زبان و ادب اردو کی استاد ہیں لیکن ان کی دلچسپی کا مواد فارسی ادب میں بھی موجود ہے۔ جو ان کی دونوں زبانوں کے ادب پر دسترس کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر بصیرہ عنبرین نے ارمغانِ حجاز کے کلام کے موازنہ و تدوین کے ساتھ وہ شاعر بھی اپنی تصنیف میں شامل کی ہے جو کسی وجہ سے استرداد کے زمرے میں آ گئی تھی۔ اس کلام میں کچھ مواد ایسا بھی ہے جسے پڑھ کر خیال آتا ہے کہ اگر یہ ارمغانِ حجاز کا حصہ ہوتا تو اس کی ادبی شان میں مزید اضافہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین کی تصنیف ''مقائسہ ارمغانِ حجاز، فارسی'' (مطبوعہ بزمِ اقبال، لاہور، نومبر ۲۰۰۷ء) اس اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں بیاض کے مطبوعہ نسخہ جات کے علاوہ مقائسہ کے ساتھ ساتھ فنِ رباعی اور اقبال کی دو ہیتی (جسے اقبال نے بابا طاہر عریاں ایک تتبع میں رباعی لکھا ہے) کا فنی و فکری تجزیہ بھی احسن طریقے سے کیا گیا ہے۔ ان مضامین کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی رقم طراز ہیں:

> ''کلام اقبال پر عمومی جائزے تو بہت ہوئے ہیں۔ لیکن اب تک ڈھنگ کا کام انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر بصیرہ نے اس کتاب میں اقبالیات کے بعض نئے پہلوؤں اور لسانی امور کے تخصیصی گوشوں کو جس ماہرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سے اقبالیات کے سرمائے میں قابلِ قدر ہوا ہے۔''

(فلیپ: مقائسۂ ارمغانِ حجاز)

اس تصنیف کی اہم خصوصیت وہ چار مقالات ہیں جو بظاہر علاحدہ موضوعات کے حامل دکھائی دیتے لیکن داخلی لحاظ سے باہم مربوط ہیں۔ پہلا اہم موضوع ''رباعی، دوبیتی اور بابا طاہر عریاں'' کی شاعری پر محیط ہے۔ اس سے اگلے باب میں بابا طاہر عریاں کے تتبع میں تخلیق کردہ حضرت علامہ کی دوبیتیوں کا فکری وفنی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ یوں ان ابواب نے موضوع کے پس منظری مطالعے کا کام انجام دیا ہے جو بہت سے دلچسپ امور کی نشان دہی کرتا ہے۔

''مقائسہ ارمغانِ حجاز، فارسی'' میں ڈاکٹر بصیرہ عنبرین نے رباعی اور اس کی مباحث کے بارے میں شمس الدین فقیر، محمد خزائلی، حسن سادات ناصری، سلیمان حییم، علی اکبر دہخدا، زین العابدین مؤتمن، سیروس شمیسا، حسین رزمجو، حسن انوشہ، میمنت میر صادقی، منصور رستگار فسیابی، ابوالقاسم پرتو، محمد بہشتی، پنڈت کیفی، نجم الغنی رام پوری، سید سلیمان ندوی، محمد التوانجی، مولوی عبدالحق، ابواللیث صدیقی، فرمان فتح پوری، محمد معین، حفیظ صدیقی اوشمیم احمد جیسے اکابرینِ فن کی لغوی واصطلاحی آرا کی روشنی میں نتائج اخذ کیے ہیں۔

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین نے اقبال کی دوبیتیوں پر اعتراض کرنے والے ناقدین کی آرا کا شاندار محاکمہ کیا ہے۔ وہ توجہ دلاتی ہیں کہ دوبیتیوں کو ''رباعیات'' کا عنوان دینا اقبال کی قلندرانہ طبع کی بدولت تھا۔ اس حوالے سے وہ اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''علامہ کی دوبیتیاں اس اعتبار سے امتیازی شان رکھتی ہیں کہ ان میں رباعی اور دوبیتی کے اوصاف مل گئے ہیں۔ یہ بھی مصرعی اور غیر مصرع ہیں۔ ان میں بھی چاروں مصرعے زنجیر کی کڑیوں کے مانند ایک دوسرے میں پیوست ہیں، اور تدریجی ارتقا بھی رکھتے ہیں، خاص طور پر چوتھا مصرع کسی نتیجے کا استخراج کرتا ہے۔ نیز متنوع موضوعات انھیں رباعی کے روایتی پند ونصائح پر مبنی موضوعاتی دائرے سے کہیں آگے لے جاتے ہیں اور ندرت بخشے دکھائی دیتے ہیں۔''

اس سلسلے میں نمونے کے طور پر ایسی متعدد دوبیتیاں درج کی گئی ہیں جو بابا طاہر عریاں کے شعری رنگ کو وسعت دیتی اور اقبال کی فنی مہارت کی دلالت کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ''ارمغانِ حجاز، فارسی'' کی بیاض اور مطبوعہ نسخوں کے تقابلی مطالعے کے دوران مصنفہ نے ایک ذہین مدون کی طرح مقائسہ کے نتیجے میں اخذ شدہ استفسارات درج کیے ہیں۔ مثلاً یہ سوال کہ اقبال اپنے ایک مصرعے میں متعدد دفعہ ترامیم کرتے تھے ایسی صورت میں کیا یہ اطمینان ضروری نہیں کہ مطبوعہ صورت میں حتمی یا ترمیمی مواد ہی شائع ہوا ہے؟ یا پھر کہیں ایسا تو نہیں کہ غلطی سے ابتدائی متن ہی شائع کر دیا گیا ہو اور اہم مصرعے اشاعت سے رہ گئے ہوں؟ اقبال کی منتخب کردہ سبھی دوبیتیاں شاملِ اشاعت ہوگئی ہیں، یا کوئی طباعت سے رہ گئی ہے؟

ڈاکٹر بصیرہ عنبرین نے ارمغانِ حجاز کی اولین طباعت (نومبر ۱۹۳۸ء) کو بنیادی متن مان کر دیگر نسخوں اور بیاض سے اس کا موازنہ کیا ہے شامل کردہ دوبیتیوں کے ساتھ ان کے صفحات نمبر کر کے بیاض اور دیگر تینوں چاپی نسخوں کے تقابلی جائزے کے بعد

ارمغانِ حجاز کے ہر حصے کی دوبیتیوں کے آخر میں حواشی کی صورت میں درج بھی کر دیا ہے۔ اس مقائسے کے دوران ایسی دوبیتیوں کی خاص طور پر نشان دہی کی گئی ہے جو یا تو واضح طور پر بیاض سے مختلف ہیں یا بیاض سے ہٹ کر ''اوراقِ پریشاں'' کی شکل میں مرتب کر دی گئی ہوں گی۔

اہل نظر جانتے ہیں کہ اقبال تخلیقی عمل میں انتہائی ریاضت کے قائل تھے۔ وہ بار بار اپنے کلام کو دیکھتے اور اس میں مناسب ترامیم کرتے رہتے تھے۔ اقبال کی خودنوشت بیاضیں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ''ارمغانِ حجاز'' چوں کہ اقبال کی نگرانی اور توجہ سے محروم رہی اس لیے ڈاکٹر بصیرہ عنبرین نے بیاض اور مطبوعہ نسخوں کا موازنہ کر کے نہایت دانش مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ابتدائی متن اور ترمیم شدہ متن کے موازنے میں دلچسپی کی بہت سی صورتیں ہیں۔

''مقائسہ ارمغانِ حجاز، فارسی'' کے آخر میں ''باقیاتِ ارمغانِ حجاز، فارسی'' کے عنوان سے اقبال کی بعض مسترد اور غیر مسترد دوبیتیاں بھی شامل کی گئی ہیں۔ جن کی تعداد باسٹھ ہے۔ نمونے کے طور پر چند رباعیاں پیش خدمت ہیں:

دلِ ما را بحکمِ دلبری گیر
خدائی را بہل پیغمبری گیر
مقامِ مصطفیؐ را خود بدانی
ازاں سلطاں رعیت پروری گیر

(حضورِ حق)

دمے از خویشتن فارغ نبودم
بہر نشتر ضمیرِ خود کشودم
چو برق اندر ظلامِ خویش دیدم
نوائے را کہ از قرآں سرودم!

(حضورِ رسالتؐ)

بہشتِ یورپ آزادے ندارد
گلش از کاغذ و خارے ندارد
ولیکن آں بہشت اندر جہاں نیست
کہ آدم دارد و یارے ندارد

(حضورِ ملت)

زمین و آسماں اندر دلِ ماست
دو صد عالم نہاں اندر دلِ ماست
بداند آنکہ غلطد در دلِ خویش
مکان و لامکاں اندر دلِ ماست!

(حضورِ ملت)

''مقائسہ ارمغانِ حجاز، فارسی'' ایسی کاوش ہے جو مشتاقانِ اقبال کے لیے توشۂ خاص کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ ڈاکٹر بصیرہ عنبرین صاحبہ کا خاص تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کے مطالعے کے دوران ڈاکٹر صاحبہ کی متانت فکر اور تحقیقی لگن کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اب تک حضرت علامہ کی شخصیت اور فکر کے حوالے سے بہت سا تنقیدی و تحقیقی کام منظر عام پر آیا ہے لیکن ڈاکٹر بصیرہ عنبرین کا اقبال کے شعری متن پر کیا گیا یہ بیش قیمت کام، تحقیق و تنقید کی دنیا میں نیا معیار قائم کرے گا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری اس کتاب کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے دیباچے میں بجا طور پر لکھتے ہیں:

''اہم ترین بات یہ ہے کہ فارسی کی وہ رباعیات جو ارمغانِ حجاز کا حصہ نہ بنیں، یا نہ بن پائیں، ان کی تدوین بھی ان کے ہاتھوں انجام پا گئی ہے، جو میرے خیال میں بہت اہم کام ہے، اور صرف اسی کام کی تکمیل پر ہی انھیں ہدیۂ تبریک پیش کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اقبال کی وہ رباعیات یا دوبیتیاں جن کے وجود و عدم کے بارے میں آج تک کوئی تذکرہ کہیں نہیں ہوا تھا، پہلی بار اقبالیات کے طالب علموں اور نقادوں کے سامنے آ رہی ہیں۔ ان دوبیتیوں میں بعض ایسی خوبصورت اور دلآویز دوبیتیاں بھی ہیں جن کو پڑھ کر خیال آتا ہے کہ کاش یہ بھی ارمغان کا حصہ ہوتیں۔ بہرحال ان کی دریافت ہی ایک بڑا کام ہے۔''

اردو کی منظوم داستانیں

مصنف

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

صفحات: ۶۸۴ قیمت: ۳۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

پروفیسر محمد جان عالم

علامہ اقبال کا ایک منفرد انداز!

شاعری کا کمال اگرچہ فکرِ عمیق اور معانیٔ دقیق میں ہے مگر اندازِ بیان، جدتِ اظہار اور ندرتِ احساس نہ ہو تو ایسی شاعری مقبول و معتبر نہیں ہو سکتی۔ شاعر کے لیے لازم ہے کہ معاشرے کی سوچ اور پسند و ناپسند سے آگاہی میں ڈرامائی کیفیت انھیں دیگر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں جدتِ اظہار، ندرتِ بیان اور سب سے بڑھ کر والہانہ خلوص (جسے وہ کبھی کبھی ''عشق'' سے بھی تعبیر کرتے ہیں) کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر　　نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود　　کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

انسان کی فطرت میں تحیر Suspence نشیب و فراز، عروج و زوال، انتشار و اضطراب، بدرجۂ اتم موجود ہے۔ قاری، جب شاعری میں اس کیفیت سے گزرتا ہے تو وہ ذہنی طور سے موضوع کی گرفت میں آجاتا ہے اور کلام اس کی بھرپور توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

اسی میں دیکھ مضمر ہے کمالِ زندگی تیرا!　　کہ تجھ کو زینتِ دامن کوئی آئینہ رو کرے

''کمالِ زندگی''، ''زیستِ دامن''، ''آئینہ رُو'' یہ وہ جاندار الفاظ ہیں جو علامہ اقبالؒ کی شاعری کا محور و منتہا اور سبب کمال ہے۔ لہٰذا، اقبالؒ کی شاعری مزید و کج دار کی نمائش، قافیہ پیمائی، تشبیہات و استعارات کی فراوانی، اظہارِ بیان کی جادوگری ہرگز نہیں دراصل ان کی شاعری میں احساسات و جذبات کو ہلا دینے والی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ یہی کیفیت ان کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' میں پائی جاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کی شاعری میں تحیرات اور انکشافات جگہ جگہ موجود ہیں۔ مثلاً وہ کہنا چاہتے ہیں کہ میری شاعری کا مقصد انسان کو وہ لائحہ عمل (Guide line) فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنی حقیقت سے آشنا و واقف ہو۔ وہ پتے کی طرح ہے ''ساحلِ افتادہ'' کی بھی مثال دی جاسکتی ہے وہ فرشتوں کو آگاہ کرتا ہے کہ ''دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو'' اور انسان کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ خدا کے سامنے سربسجود ہو اور اس کی عظمت کا اقرار کرے۔

جدوجہد، عمل اور سعی پیہم اقبالؒ کا مرکزی نقطہ ہے کارگاہِ حیات میں وہ گومگو، تامّل، بے عملی، مایوسی اور بے حسی کو کسی صورت میں برداشت نہیں کرتا۔ انھوں نے ایک مقام پر کہا ہے کہ ''ساحل'' مقصدِ زندگی سے ناواقف ہے۔ حیاتِ بے مقصد کا رونا روتا ہے اور کہتا ہے کہ اس وسیع سمندر میں پڑا ہوا ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ زندگی کن مقاصد کے تحت وجود میں آئی ہے۔ موج اسے آگاہ کرتی ہے کہ زندگی کن مقاصد کے تحت وجود میں آئی ہے۔ حاصل یہ کہ زندگی رواں دواں ہے تو وہ وجود رکھتی ہے ورنہ اس کے لیے عدم ہے جس طرح کہ ''موج'' میں جمود اس کی موت ہے۔

اقبالؒ اذہان کے دریچے کھولتے ہیں اور کہتے ہیں کہ برطانوی سامراج اور استعمارِ جدید نے برصغیر کے مسلمانوں میں دین سے بیزاری اور لاتعلقی پیدا کر دی ہے۔ نژادِ نو اس سے متاثر نظر آتی ہے۔ جدید تعلیم نے انھیں مادہ پرست بنا دیا ہے اقبال کا یہ نقطۂ نظر ناقابل تردید تھا۔

اوّل تو فردوس میں ایک ایک مکالمہ کا عنوان ہی تحیر و تجسس لیے ہوئے ہے۔ لہٰذا ان دو بزرگوں کے تبادلۂ خیالات کے دین کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ مکالمہ ڈرامے کی جان ہے مکالمے ہی کے ذریعے واقعات بڑھتے ہیں اور خیالات میں نت نئی تبدیلی اور کردار کے محاسن و عیوب کی نشان دہی ہوتی رہتی ہے اس طرح کا ایک اور مکالمہ، خدا اور انسان کے درمیان ہے خدا، انسان کی بے راہ روی پر گرفت کرتا ہے اور سوال کرتا ہے:

من از خاکِ پولادِ ناب آفریدم
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

انسان بڑی بے باکی سے جواب دیتا ہے۔ دراصل انسان خلاصۂ کائنات ہے۔ انسان کا وجود، خدا کی ربوبیت کی دلیل ہے۔ علامہ اقبالؒ کی شاعری میں انسان کو بلند مقام حاصل ہے:

لغزہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

مذکورہ بالا نظم ''خدا اور انسان'' میں انسان کہتا ہے:

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و زاغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم

ترجمہ: اے خدا! تو نے رات بنائی۔ میں نے رات کے اندھیرے کو دور کرنے کے لیے چراغ بنایا۔ تو نے شیشے کو وجود بخشا میں نے شیشے کو ڈھال کر پیمانہ بنایا۔ تو نے جنگل و بیاباں بنائے میں چمن و گلستان بنا کر تیری تخلیق میں چار چاند لگا دیے۔

ملاحظہ فرمایئے کہ ایک مقام پر ''جگنو اور پروانے'' کی گفتگو ہے۔ اگرچہ مختصری نظم ہے۔ مگر گہری سوچ کی حامل ہے۔ بلکہ آج

کل کے تناظر میں تو اس میں بلیغ اشارے ہیں:

پروانہ کہتا ہے:

پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتشِ بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

اب جگنو جواب دیتا ہے:

اللہ کا صد شکر کہ پروانہ نہیں میں
دریوزہ گر آتشِ بیگانہ نہیں میں

جگنو کے جواب میں اقبالؒ کی خودداری اور غیرت کی تلقین ابھر کر سامنے آ گئی ہے۔ بقولِ حسرت موہانی ''کوششِ ذاتِ خاص پر، ناز کر اعتماد کر'' مانگے تانگے کی چیز قابلِ قبول نہیں۔ وہی شئے مقبول اور باقی رہنے والی ہے جس میں اپنی کوشش کو دخل ہو۔

شاعرِ مشرق کی نظر میں منطق و فلسفہ اگرچہ پڑھنے اور پڑھانے کے لیے رکشش انگیز موضوعات ہیں مگر زندگی کی گاڑی چلانے میں کارگر نہیں۔ دین میں استحکام اور عقائد کی مضبوطی پہلے ایمان کی ضرورت ہے۔ ہمیں قرآن پاک اور اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر راہِ پرآشوب میں روشنی کا حصول سعی لاحاصل ہے۔

یورپ جو فلسفۂ جدید کا مرکز و منبع ہے۔ اقبالؒ اس کے ''رازِ درونِ خانہ'' سے آشنا کرتے ہیں:

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں — لاتے ہیں سرور اوّل، دیتے ہیں شراب آخر

اقبال جرمنی کے مشہور فلسفی نٹشے کے بارے میں چیلنج کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں — تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

اقبال ایک پرآشوب دور میں زندہ تھے اس لیے انھوں نے یہ سعی اور عملِ پیہم کی محض تلقین ہی نہیں کی بلکہ اپنی شاعری کے ذریعے بے یقینی خوف و ہراس، مایوسی و تاریکی کا سدباب کیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ برصغیر وسطِ ایشیا اور دنیائے عرب بے حس و حرکت پڑی ہوئی ہے۔ موجودہ حالات تو اور بھی دلکش ہیں انھوں نے ملّت خوابیدہ کو جگانے کے لیے اپنی سعی آخیر وقت تک جاری رکھی یوں سمجھیے کہ علامہ اقبالؒ نے زندگی کو متحرک، آرزوؤں سے معمور اور حرکت و عمل کے چراغ سے منور کر دیا ہے۔ ان کا کلام اردو ہو یا فارسی، قوم و ملّت کے لیے مژدہ جانفزا ہے۔ روح کی طمانیت اور ذوق کی بلندی و برتری سے معمور ہے۔ اقبالؒ نے بتایا کہ زندگی بے کار محض یا دیوانے کا خواب نہیں یہ ایک حقیقت شناس انسان کے لیے بے انتہا امکانات لیے ہوئے ہے۔

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

سید اظفر رضوی

اقبال کا تصور اسلام

تاریخ گواہ ہے کہ سرزمین عرب کے تہذیبی ارتقا میں ''تصور اسلام'' ہر پیغمبر کے عرصہ حیات اور حالات کے تقاضوں کا امین تھا اور بلاشبہ ہر پیغمبر نے اپنے دور کے موجود مذہبی اعتقادات سے بغاوت کے بعد انقلاب برپا کیا جس سے انسانیت کو فکر و تدبیر اور تعلیم کی روشن راہ نصیب ہوئی۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے اس پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے اسلام کا تصور یوں بیان کیا کہ:

فطرت کو خرد کے روبرو کر
تسخیر مقامِ رنگ و بو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اُس سے نہ ہو سکا وہ تو کر!

اس پس منظر میں ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہے کہ سرزمین پاک و ہند میں علامہ اقبال نے دورِ غلامی سے نجات کے لیے ''اسلام'' کو اپنے کلام کے ذریعے کس طرح اخوت، محبت، رواداری، آزادی، انسان دوستی اور پاکیزگی کا ذریعہ بنایا ہے آج سرزمین پاکستان پر یہ بحث عام ہے کہ اگر تاریخ آزادی کے کارکنوں کا دعویٰ تسلیم کر لیا جائے کہ پاکستان کا قیام دراصل علامہ اقبال کا خواب تھا تو سرزمین پاک کی موجودہ سیاسی، سماجی، معاشی صورت حال کو خواب اقبال کی حقیقی تعبیر ہی قرار دیا جائے گا یا نہیں؟

اس بحث کے مختلف پہلوؤں پر علمی، ادبی اور نظریاتی زاویہ نگاہ سے تجزیہ کیا جائے تو یقیناً خود تنقیدی کے ذریعے پاکستانی قوم کے عوام اور حکام اپنے مستقبل کو مزید بہتر کرنے کی حکمت عملی طے کرنے کی فکر کر سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں یہ دلیل توجہ طلب ہے کہ ہم اقبال کے تصور اسلام کی بحث کو دور جدید میں لایعنی بحث قرار نہ دیں بلکہ اپنے احوال و کوائف کے بے سمتی کے منظر کو بدلنے کی خواہش، آرزو اور تمنا کو اپنے قلب و نظر میں زندہ رکھنے کا پختہ عزم کریں تو یقیناً سنگدلانہ بے حسی کے مرض سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نسخۂ شفا میسر آ سکے گا۔

پاکستانی ثقافت میں ''اقبال، تصور اور اسلام'' کی تثلیث دراصل پاکستانی تاریخی پہچان کا نشان ہیں اور علامہ اقبال کی شخصیت کی پہچان میں تعلیم، شاعری، فلسفہ، اور سیاسیات کے وہ بنیادی چار ستون ہیں جن سے ہم اقبالیات اور ''اقبال کے تصور اسلام'' کا منظر دیکھ

اور پرکھ سکتے ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ حکیم الامت شاعر مشرق علامہ اقبال نے ''اسلام'' کے تناظر میں فرد یا مسلمان کی بحیثیت فلسفی، معلم اور سیاست دان کے کس انداز میں تشریح وتعریف کی اور اپنے دور کے مسائل ومشکلات اور انسانی وقار و احترام کو جہالت، ظلم اور حکمران طاقتوں کی زنجیروں سے نجات دلانے کے لیے ''اسلام'' کے پیغام کو کس حد تک عدم تشدد، تحمل، رواداری، انسان دوستی اور انسانی امن وسلامتی، کی محکم اساس فراہم کی، یعنی ایسی فکری بنیاد جس سے نئی نسل جدید زمانے کی تیز رفتار اور سائنس وٹیکنالوجی کے انکشافات کی نئی عالمی فضا کو اخلاقی اقدار کی روشنی سے مربوط اور ہم آہنگ رکھنے کی قوت حاصل کرسکے۔ اس منزل اور مقام کی تفصیلات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہمیں نئی نسل کے اس اہم سوال کو اہمیت دینا ہوگی کہ اقبال اپنے دور کے اجتماعی ضمیر کو جگانے کی ترقی پسندانہ پیش قدمی کا سرخیل تھا یا نہیں! ہم سمجھتے ہیں کہ اس سوال کا جواب سرزمین پاک وہند بلکہ عالمی ادب میں ہمارے دور کے عظیم ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض نے دیا ہے، فیض احمد فیض کی نظم ''اقبال'' کا مفہوم ومطلب یوں ہے کہ:

> ''ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر آیا، اور اپنی دھن میں غزل خوانی کرتا چلا گیا اُس کی غزل خوانی کی دھن سے عوام تازہ دم ہوگئے بلکہ سنسان راہیں خلق خدا سے آباد ہوگئیں اور دل ونگاہ میں سرمستی کی وجہ سے ویران محفلیں رنگ ونور سے سج گئیں۔ اس خوش نوا فقیر کی دھن کو چند لوگ ہی جان سکے مگر کم نظری کی وجہ سے چند باصلاحیت اور باخبر لوگ ہی اپنی نگاہ کو اس کی اصل حقیقت کے قریب لاسکے مگر اس کی غزل خوانی کا روحانی اثر تمام دلوں میں اثر انداز ہوا۔ وہ بادشاہ جو فقیرانہ انداز رکھتا تھا اب دور جاچکا ہے اور اپنے دیس کی راہیں پھر سے اداس ہیں اس کی کوئی ادائے خاص گنتی کے چند لوگوں کو یاد ہے یا پھر چند عزیزوں کے پاس اُس کی نظریاتی اساس کے پہلو موجود ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے مگر اس حقیقت کے باوجود اس کا گیت ادب شناس لوگوں کے قلب ونظر ہی میں نہیں بلکہ عام خلق خدا کے دلوں کی حساس دنیا میں بھی موجود ہے اور اس کی دھن اور لے سے اکثر لوگ نور لذت سے فیض حاصل کرتے ہیں۔''

فیض صاحب نے اپنے خیالات میں اس اہم سوال کی نشاندہی کی ہے کہ اقبال کے حسن کلام سے آیا آج بھی فیضاب ہونے کی صلاحیت اور قوت یا ذوق وشوق موجود ہے یا نہیں۔

سماجی سائنس کے عام طالب علم کے لیے یہ بات نئی نہیں کہ موجودہ دور میں آرٹ کے علم وفن کو عصر جدید کی نفسیات سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے اور سائنسی طرز فکر یعنی ''مشاہدہ، تجربہ، تجزیہ کے عقلی نتائج'' کے ہتھیار کے ذریعے دور جدید کے میدان عمل میں سرگرم عمل ہونے کی طاقت حاصل کی جاسکتی ہے۔ علامہ اقبال نے اس جدت کی اساس کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ:

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل

عذاب دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

علامہ کی مشہورِ زمانہ کتاب ''ضربِ کلیم'' کی ایک نظم کا عنوان ہی ''اسلام'' ہے اس نظم میں علامہ نے یورپ کی ''اسلام'' سے کدورت کا ذکر کیا ہے لیکن ان کی اس منفی سوچ کو بدلنے کے لیے انسانی تاریخ کا نچوڑ بتایا ہے کہ آپ اس لفظ سے کدورت ختم کریں یا نہ کریں مگر اس نام کی تہہ میں غیرت، امن، عزت، وفا، محبت، انسانی عظمت اور تحمل اور عدم تشدد کا جذبہ موجود ہے لہٰذا ہر دور کا انسان ان اخلاقی اقدار کے حصول کے لیے اپنے اپنے دائرہ کار اور میدان مفادات و ترجیحات میں اگر ان سے بے لگام ہوگا تو انسانیت پر ظلم و زیادتی، تشدد، نفرت کے سیارہ بادل چھا جائیں گے، اور یہ دنیا جہنم کی سی آگ کی تپش سے برباد ہو جائے گی لہٰذا ''اسلام'' محبت و اخوف انسانی اور احترام آدمیت کا پیغام دیتا ہے جو ہر دور میں انسانی اخلاق کی تعمیر کی منزل مقصود ہے۔

علامہ اقبال کے تصور اسلام سے عقل و فکر کے تحریکی جذبے اجاگر ہوتے ہیں جس سے شاعر کی ہستی کا شعلہ دراصل اس کے فن کو بقائے دوام بخش دیتا ہے۔ شعر و ادب کے دربار بقائے دوام میں کسی بھی فنکار یا تخلیق کار کا شعلہ خو ہونا، شعلہ رو ہونا، شعلہ زن ہونا، یا شعلہ فشاں ہونا یقیناً اس کی ہستی کے اضطراب، بے چینی اور بے قراری کا مظہر ہوتا ہے۔ شاعر اپنی ذات اور فن کے میدان عمل میں عشق و مستی اور والہانہ پن کے ایسے چراغ روشن کرتا ہے جس سے عام لوگ اپنے قلب و نظر کو جہالت کے اندھیروں سے نکالنے کا اہم ذریعہ سمجھتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بحیثیت شاعر، فلسفی، معلم اور سوشل سائنٹسٹ کے نہ صرف اپنے دور کے سکوت، خاموشی اور غلامانہ بے بسی کے ماحول کو تبدیل کرنے کے لیے چیخ و پکار کی بلکہ والہانہ وجد سے دھمال کا سماں بھی پیدا کیا جس سے انقلابی روح پیدا ہوئی اور ''تحریک آزادی'' کو کامیابی کے چار چاند لگ گئے! علمی تقاضا یہ ہے کہ ''اسلام'' کے لفظی معانی کو سامنے رکھا جائے جو تحریک اسلام سے قبل بھی عام عربوں میں مستعمل تھے۔ ''اسلام'' کے لغوی معنی ''خود سپردگی، جھک جانا خود کو حوالے کر دینا۔'' تحریک اسلام میں جو لوگ حضور پاک کی تعلیم کو اُن کی قیادت کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دینے کا اقرار کر لیتے تھے۔ انھیں شرعی اصطلاح میں ''اسلام کا پیروکار'' خیال کیا جاتا تھا یعنی وہ پیغام جو پیغمبر اسلام نے اپنے دور میں عربوں کو دیا وہ ''اسلام'' ہو گیا۔ عربوں کے دین اور دین اسلام میں یہ فرق نمایاں ہوا مقصد یہ ہے کہ وہ الفاظ مثلاً اللہ، دین، قرآن، صلوۃ، صوم، حج کے تمام الفاظ انقلاب اسلام کے بعد رحمت و برکت سے نئے معانی اور نئے اُفق سے آشنا ہوئے اور انقلاب اسلام نے ان لفظوں کو جمود کی حالت سے نکال کر متحرک کر دیا علامہ اقبال اس انقلابی فکر اور تحریک کو اپنے حالات میں بھی زندہ رکھنے کی سعی و کاوش کرتے رہے۔ اُن کے نزدیک ''اسلام کا تصور'' کسی قسم کے جمود کا نام نہ تھا بلکہ انسانیت کو متحرک رکھنے کا وسیلہ اور ذریعہ تھا تاکہ جہالت کے ایسے تقدسات کو مسمار کیا جا سکے جو انسانی احترام، مساوات، ترقی و خوشحالی، رواداری اور علمی سربلندی کے سفر کو روکنے کا موجب بنتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ''ملائیت کی

اذان'' کو اپنے تصور اسلام میں نئے آہنگ بخشے جو دراصل پیغمبر اسلام کی سیرت و تعلیم کا ورثہ ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنی کتاب تشکیل جدید الہیات اسلامیہ Reconstruction & Religious thoughts in Islam میں اس عصری دینی ضرورت کو اجاگر کرنے کی علمی کوشش کی ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ملائیت کے زیر اثر ہمارے پاکستانی سماج میں علامہ اقبال کی اس قیمتی علمی متاع سے فیض یاب ہونے کی کسی بھی علمی و فکری اور سیاسی تحریک نے کوشش نہیں کی تاکہ پاکستانی قوم جدید دور کی نمائندہ اور معتبر قوم بن سکے، نئی نسل کا فرض ہے کہ وہ اس ''فردوس گم گشتہ'' کی آبیاری کرے اور اپنے صحن، کو سرسبز و شاداب اور جنت نظیر بنا سکے۔ ''اقبال کے تصور اسلام'' کا مقصد ہی یہ تھا کہ آزادی فکر سے لیس ہو کر عوامی فلاح و بہبود کی مثالی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے جس میں عدم تشدد، تحمل مزاجی، امن اور علم دوستی کی ایسی پرنور فضا ہو جو اقوام مشرق و مغرب کے لیے باعث رشک ہو سکے! بلاشبہ یہ نصب العین قابلِ عمل ہے اور قابلِ حصول بھی۔ آپ یورپ کی ترقی، چین و جاپان کی ترقی اور انقلاب ایران کی سماجی بیداری سے یقیناً اپنے عزم کو پختہ اور حوصلوں کو بلند تر کر سکتے ہیں اور یہ کام ہر طالب اپنے اپنے دائرہ کار میں ذمے دارانہ انداز سے نبھانے کا عملی مظاہرہ کرے تو یقیناً منزل کا حصول آسان تر ہوگا اور اجتماعی قیادت بھی فطری طور پر سامنے آجائے گی!

اقبال کے تصور اسلام کے عنوان میں ''تصور'' کے عام لفظ کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے تصور کے لغوی معنی ہیں ''دل میں تصویر بنانا، دھیان مراقبہ، خیال، سوجھ، منطق کی اصطلاح میں کسی چیز کا حکم کے بغیر عقل میں آنا۔''

تصور دراصل ذہنی حسیاتی اور فکری کیفیت کا نام ہے اور محسوسات کے عالم میں کسی رنگ، آواز اور نقش اور خیال بھی تصور کہا جائے گا۔ اقبال کے تصور اسلام میں ہر انسان اپن اخلاق کو حسن بخش سکتا ہے اور اس میں درجہ ذیل خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو علامہ اقبال کی شعری اور نثری تحریروں اور عملی کاوشوں کا نچوڑ ہے جسے آج کے دور میں بھی انسانی فلاح کا پاکیزہ سفر قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

۱) خودداری: انسان، بے نیاز اور خوددار ہو جاتا ہے وہ اپنے اعمال کے احساس ذمے داری سے لاپرواہ نہیں ہوتا۔

۲) مساوات: وہ دوسرے انسانوں کو اپنے برابر اور باعث احترام سمجھنے لگتا ہے کہ دوسرے انسانوں کے دکھ خوشی کو اپنی ذات کا حصہ سمجھنے اور ان کی فلاح و بہبود کی تدبیر کرتا ہے، اپنی زبان سے اور اپنے عمل سے بھی۔

۳) انکساری: اللہ کے سامنے بے بسی کے اقرار سے منکسر المزاج ہو جاتا ہے اور دوسرہ انسانوں کے سامنے خود کو بے بس محسوس نہیں کرتا۔ اعمال صالحہ اور خدمات خیر کا مرکز بننے کی کوشش کرتا ہے۔

۴) وسعت نظر: تنگ نظر نہیں ہوتا۔ سارے جہاں کی خیر اور سلامتی کا نہ صرف طلب گار ہوتا ہے بلکہ اپنے عمل سے تشدد اور ظلم سے پرہیز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ امن اور آشتی اور صلح جوئی سے زندگی گزارنے کا طریقہ، سلیقہ اور قرینہ بتاتا ہے۔

۵) اطمینان اور تحمل: اللہ تعالیٰ کو اپنی شہ رگ سے قریب رکھنے کا احساس ''اطمینان'' کی کیفیت بخشتا ہے اور غصہ اور نفرت کی منفی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔

۶) رجائیت اور امید پرست: اپنی ہستی کے تمام جذبات و احساسات کی ایسی تربیت کرتا ہے کہ ناامید مایوسی اور بے چارگی کی اذیت اور دکھ قید سے آزاد ہوتا ہے، اللہ کے فضل و کرم کی تلاش میں پیش قدمی کا حوصلہ رلکھتا ہے۔

۷) محتاط رویہ: یعنی ظاہر و پوشیدہ اعمال و حرکت کو دیکھنے والا اللہ ہے، اس ایمان کے بعد وہ اپنے ظاہر و باطن میں محتاط ہو جاتا ہے اور گناہ نہیں کرتا۔ ایمان کی روشنی سے کبھی اپنے آپ کو اندھے پن کا شکار نہیں ہونے دیتا۔

۸) توکل بھروسا اور اعتماد: اپنے وجود کی بقا و سلامتی کے لیے پریشانی سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ خود یہ بھروسا اور اعتماد کرتا ہے اور دوسرے انسانوں کے معاملات، اخلاق اور معاشرتی رویوں میں توازن یا پاکیزگی کا باعث بن جاتا ہے۔ اقبال کے تصور اسلام میں تمام تر مقصد حرکات و سکنات نتیجہ خیز بلکہ انقلاب پرور نہیں ہو سکتیں جب تک ''انسان کی روح شامل نہ ہو۔

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

۹) ضبطِ نفس: اسلام کی تربیت ضبط نفس کا باعث ہوتی ہے اور اگر ہم اپنے نفس پر ضبط نہ رکھ سکیں تو پھر ''اسلام کا تصور'' حقیقی طور پر کوئی اثر نہیں رکھے گا۔ یہی آرزو علامہ اقبال کی ہے کہ مسلمان فرد اور معاشرہ اور قوم جدید احساس ضبط نفس سے مالا مال ہوتا ہے کہ ترقی و خوشحالی کا سفر طے کر سکے۔

۱۰) ظریف و خوش مزاج: علامہ اقبال کو حکیم الامت کہا جاتا یعنی امت کا معالج! اس سلسلے میں ایک اہم واقعہ یوں ہے کہ اُن کے ایک دوست نے کہا کہ آپ حکیم کیسے ہیں۔ جب آپ نے طب اور ڈاکٹر وغیرہ کی سند حاصل ہی نہیں کی لوگ آپ کو ''حکیم'' کیوں کہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے جواب میں کہا کہ میرے پاس ایسا نسخہ ہے جس سے لوگ آپ کو بھی ''حکیم'' کا خطاب دے دیں گے۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ مجھے بزرگوں کی صحبت سے یہ توفیق نصیب ہوئی کہ کروڑ بار میں نے درود شریف کا ورد کیا اور اس کے صدقے اور برکت کے طفیل لوگ مجھے ''حکیم الامت'' کہتے ہیں۔

علامہ اقبال نے بالِ جبریل کی نظم ''جاوید کے نام'' میں اس نکتے کو یوں واضح کیا ہے کہ:

ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

اقبال کے تصور اسلام عام انسانوں کو بھی حسن ارادت کی شمع جلائے رکھنے کا عملی ثبوت ملتا ہے اس لیے وہ تاریخ اسلام سے عبرت حاصل کرنے اور عام مسلمانوں کے لیے حسن عقیدت کو زندہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اقبال کا تصور اسلام مناجات و تسبیحات کے اثر سے پرامن زندگی اور اطمینان قلب کی دولت کا وسیلہ ہے اور وہ کسی بھی الہام وجدان عرفان اور روحانی تجربے کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں جس سے انسانی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے:

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خداداد
ہے مرد خدا! تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد
مسکین و محکوی و نومیدی، جاوید
جس کا تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

علامہ اقبال کا ''تصور اسلام'' جدید دور کے لیے ایسا دلکش پیغام ہے جس سے ہر عام و خاص رہنمائی حاصل کر سکتا ہے، اہل علم رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں اس ابدی سچائی سے فیض حاصل کرنا دراصل انسانی فلاح بہبود اور عمل صالح کا ثبوت ہے مگر وہ لوگ جو جمہود زدہ ذہن اور بت پرستانہ خصلت کے شکار ہو جاتے ہیں وہ اس ابدی سچائی سے بھی اپنے دل و دماغ کو روشن کرنے کی بجائے انسان کو جہالت کے اندھیروں میں ڈالنے کا موجب بن جاتے ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے علما کو ہمیشہ بت پرستانہ ذہنیت کا مقابلہ کرنا پڑا اور ظلم و بربریت کی چکی میں پسنا پڑا ہندوستان کے مسلمانوں نے جب شاہ ولی اللہ کے قرآن کریم کے فارسی ترجمے کو دیکھا تو اس دور کی ملائیت نے ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا حالاں کہ اس وقت ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی تھی اور ان کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ عربی سے ناآشنا ہیں وہ بھی قرآن کریم کی بارگاہ سے فیضاب ہو جائیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ حادثہ بھی رقم ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ہوئی اور ہر طرف مایوسی بے بسی بددلی کا سماں تھا مگر سرسید احمد خان نے اس صورت حال میں مسلمانوں کی ترقی اور بقا کے لیے ''تصور اسلام'' کے پس منظر میں راہ عمل کا تعین کیا اور ثابت کیا کہ اندھی طاقت کا مقابلہ علم کے چراغ جلا کر کیا جا سکتا ہے۔ مصور پاکستان علامہ اقبال نے بھی شاہ ولی اللہ اور سرسید احمد خان کی پیروی کرتے ہوئے ''روح تصور اسلام'' کو زندہ رکھنے کی سعی و کاوش کی خلافت عثمانیہ کے ختم ہونے کے بعد عالم

اسلام کی بے چارگی کو آس و امید کی روشنی دکھائی اور فرمایا:

اگر عثمانیوں پہ کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اقبال کے تصور اسلام میں آسمانوں پر ہزاروں ستاروں کے غائب ہونے میں اندھیرا چھا جاتا ہے اور پھر اس کے بعد قدرت اور فطرت انسانیت کو صبح کاذب و صبح صادق سے روشناس کراتی ہے۔ لہٰذا اقبال کا تصور اسلام دراصل ہر دور میں زندگی کی بقا اور انسانیت کی فلاح کے حصول کی تگ و تازہ کا نام ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''ضربِ کلیم'' میں ''اسلام اور مسلمان'' کے عنوان سے بیشتر مختصر نظمیں تحریر کیں جو اُن کے افکار و خیالات اور نظریات کو واضح کرتی ہیں وہ اپنے ''تصور اسلام'' میں اپنے مقام کا تعین کرتے ہوئے فیصلہ سناتے ہیں کہ مجھے قدرت نے ایشیا کا خس و خاشاک عطا کیا مگر میرا تصور اسلام کا شعلہ ایسا پرنور اور بے باک ہے۔ جس سے ایشیائی ممالک کے عوام اور حکام اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کرنے کے لیے موجودہ حالات میں بھی متحرک و مستعد ہو سکتے ہیں۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستیوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الہ الا اللہ

علامہ اقبال کا تصور اسلام اور ملایت کے مذہبی تصورات میں تضاد اور تصادم کی فضا سے ہر تاریخ کا طالب علم آشنا ہے اور اس حقیقت کو جانتا ہے کہ ملائیت کے قائدین نے خود تنقیدی کا فکری رویہ نہیں اپنایا اور ماضی کے بتوں کی پرستش میں مصروف رہنے میں ہی نجات کا تصور دیا جس کی تصویر علامہ اقبال نے یوں نقش کی ہے:

اسی قرآن میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

علامہ اقبال نے ''ملائے حرم'' کی نظم میں بھی اپنے تصور اسلام سے اہل فکر و دانش کو روشناس کرانے کی سعی و کاوش کی ہے اور جدید دور کے سماجی انقلابات کے ساتھ ساتھ احترام آدمی کے مقام کو روح اسلام قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے پوشیدہ ہے آدمی کا مقام

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے میری سحر کا پیام

علامہ اقبال کی اس نظم کے مفہوم سے مطابقت رکھتی ہوئی ایک نظم امریکی استاد نے اسی دور میں کہی تھی۔ The voice of GOD

''صدائے ربانی''

I sought to hear the voice of God
And climbed the top most steeple
But God declared "GODown Again"
I dwell among the people.

ترجمہ:

''میں صدائے ربانی کو سننے کی خواہش لے کر معبد کے مینار کی بلندی کی چوٹی پر گیا، صدا آئی کہ نیچے اتر جاؤ، میں عوام میں رہتا ہوں۔'' علامہ اقبال نے ہندوستانی خانقاہیت کو بھی برہمنیت سے آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ جوان کے تصور اسلام کی واضح دلیل ہے۔ اُن کی مشہور زمانہ نظم ''نبوت'' میں جو پیغام ہے وہ اُن کے تصور اسلام کی وضاحت کرتا ہے جو آج بھی نئی نسل کے لیے راہنمائی کا ذریعہ ہے اور عصر نو کی شب تاریک میں روح اسلام کے چراغ جلانے کی عقلی راہ دکھاتا ہے:

میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیہہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں، مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام
عصر حاضر کی شب تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفت ماہِ تمام
''وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام''

علامہ اقبال کے ''تصور اسلام'' کو سمجھنے کے لیے یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ انھوں نے مشرقی ملائیت اور مغربی ملائیت پر تنقید کے ساتھ ساتھ عالمی سطح کے ظالمانہ نظام اور اس کی پیدا کردہ تہذیب و تمدن پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور روح عصر کو اصل تصورِ فطرت سے ہم آہنگ رکھنے کی آرزو کو نمایاں کیا ہے۔ ان کی مشہور زمانہ نظم ''مکہ اور جنیوا'' آج کے دور میں بھی غور طلب ہے اور ملت اسلامیہ کے قائدین کو محکم اساس فراہم کرتی ہے:

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

آج کے جدید ذہن میں گلوبل ویلیج کا تصور عام کیا جارہا ہے اور علامہ اقبال نے اسی خیال کو ملتِ آدم کی ادبی اصطلاح میں واضح کر دیا تھا لہٰذا پاکستان کی فضاؤں میں اس امر کی اہم ضرورت ہے کہ رنگ و نسل مذہب، زبان اور علاقے کی تنگناؤں سے بلند ہو کر انسانیت بلکہ ملّت آدم کے خواب کی عملی تعبیر کی راہ عمل اختیار کریں اور اگر ہم نے یہ راہ نہ اپنائی تو علامہ اقبال نے خبردار کیا ہے کہ:

اگر قبول کرے، دین مصطفیٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

علامہ اقبال کے تصور اسلام کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کلام کی نورانی کیفیت اور ان کی تقاریر و مضامین کی دانش برہانی کو اپنے فکر و خیال میں جگہ دینا ہوگی تاکہ ہم نوع انسانی کی بقا کی جنگ میں کامرانی حاصل کر سکیں جس کا نسخہ علامہ اقبال نے اس شعر میں عطا کیا ہے:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیان ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

اقبال کا تصور اسلام ہمیں آج کی موجودہ پاکستانی فضاؤں کی معرکہ آرائیوں میں بھی سحر آشنا کرتا ہے اور ہمیں انسانیت دوستی، محبت، یگانگت، الفت، عدم تشدد، بھائی چارہ، تحمل مزاجی اور پرامن زندگی گزارنے کی راہ دکھاتا ہے اور اگر ہم اقبال کے تصور اسلام سے فیضیاب نہیں ہوں گے تو اس کا انجام بھی مزید پریشانیوں اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنے کے سوا کچھ نہ ہوگا:

دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا
تو بھی نمازی، میں بھی نمازی
میں جانتا ہوں انجام اُس کا

ڈاکٹر سید وسیم الدین☆

ڈاکٹر اقبال کی زندگی کے اہم پہلو

ڈاکٹر علامہ اقبال کی پیدائش ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء/ ۳ر ذیقعد ۱۲۹۴ھ ہے۔ آپ کے والد کا نام شیخ نور محمد اور والدہ کا نام اِمام بی بی تھا۔ ابتدائی تعلیم سکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ سے حاصل کی۔ پرائمری ۱۸۸۷ء، مڈل ۱۸۹۰ء اور میٹرک ۱۸۹۲ء کے امتحانات اعزاز سے پاس کیے۔ اس دوران یہ اسکول سکاچ مشن کالج میں تبدیل ہو گیا چناں چہ یہیں سے ۱۸۹۴ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ جرمنی کی میونخ یونی ورسٹی سے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس ڈگری کے لیے اپنے ذوق کے مطابق ''ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' کے موضوع پر تحقیق کی۔ یہ تحقیقی مقالہ ''فلسفہ عجم'' کے نام سے اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اپنے مقالہ کی تیاری کے لیے میونخ اور برلن کے علاوہ ہائیڈل برگ میں خاصی دیر تک قیام پذیر رہے، چناں چہ اب بھی وہاں ایک تختی نصب کی ہوئی موجود ہے جس میں اقبال کا نام اور دورانِ قیام کی تاریخیں درج ہیں۔ تحقیقی سرگرمیوں کے علاوہ اقبال نے سیاست میں بھی گہری دلچسپی لی۔ اپنے قومی طرزِ فکر کی بنا پر انھوں نے سیاست میں عملی طور پر حصہ لیا لیکن اسے بطور پیشہ نہ اپنایا۔ چناں چہ ۱۹۲۳ء میں عوام و خاص کے اصرار کے باوجود بھی پنجاب کونسل کی رکنیت کے امیدوار نہ بنے، البتہ ۱۹۲۶ء میں انھیں عوامی خواہشات کے آگے جھکنا پڑا اور الیکشن جیت کر پنجاب کونسل کے رکن منتخب ہو گئے بلکہ اقبال کی سیاسی زندگی کا آغاز بھی اس سال اور رکنیت سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کا خطبہ الٰہ آباد اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ اس موقع پر آپ نے فرمایا کہ:

> ''میری خواہش یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے، خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ میں حکومت خود اختیاری حاصل کرلے یا باہر رہ کر مجھے تو نظر آتا ہے کہ اور انھیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی حکومت قائم کرنی پڑے گی۔''

۱۹۳۱ء میں وہ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے اور اس سے اگلے سال تیسری گول میز کانفرنس کے لیے بھی اور پیرس جا کر مشہور فلسفی ہنری برگساں سے ملاقات کی، واپسی پر اسپین رکے جہاں ان کی خاطر مسجد قرطبہ کھولی گئی اور سیکڑوں سال بعد وہاں اقبال نے نماز ادا کی۔ میڈرڈ یونی ورسٹی میں ایک خطبہ بھی دیا جس کا موضوع ''اسپین اور عالمِ اسلام کا ذہنی ارتقا'' تھا۔ اہلِ علم

☆صدر شعبۂ بین الاقوامی تعلقات عامہ، جامعہ اردو

نے اس خطبہ کو بہت سراہا۔ ۱۹۳۳ء میں شاہ افغانستان محمد نادر شاہ کی دعوت پر سلیمان ندوی اور سر سید احمد خاں کے پوتے سر راس مسعود کے ہمراہ تین ہفتے تک افغانستان کا دورہ کیا جہاں شاہ کو جدید تعلیمی اصلاحات اور یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مفید مشورے دیے۔ ۱۹۳۴ء میں قائد اعظم نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کی تو اقبال اُن کے ساتھ تھے۔ چناں چہ اقبال نے پنجاب میں مسلم لیگ کو نئے سرے سے منظم کرنے کے لیے پنجاب مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کیا جس نے آپ ہی کو بطور صدر چنا۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں اہلِ علم کی خواہش پر مدراس جا کر اسلام پر انگریزی میں چھ خطبات دیے جو ۱۹۳۰ء میں "Reconstruction of Religious thoughts in Islam" کے نام سے طبع ہوئے۔ واپسی پر میسور اور حیدر آباد دکن بھی گئے۔ ۱۹۳۵ء میں نواب حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال نے تاحیات ۵۰۰ روپے کا وظیفہ مقرر کیا۔ ۱۹۳۴ء میں ''جاوید منزل'' تعمیر کی۔

۱۹۲۸ء میں سیاست سے عملی دلچسپی کے بعد وکالت کی آمدنی میں کمی واقع ہوگئی تھی اور اب گزر اوقات یونی ورسٹی امتحانات اور کتابوں کی فروخت پر ہوتی تھی۔ بیماریوں کے باعث آخری تین سالوں میں وکالت کی آمدنی صفر رہ گئی تھی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صفدر محمود لکھتے ہیں کہ: ''انکم ٹیکس کی فائل کی روشنی میں علامہ اقبال کی زندگی پر نگاہ ڈالیں تو درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں جس سے قاری خود نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے ۱۷-۱۹۱۶ء سے لے کر وفات تک کل ۱۹۸،۸۴۶ء روپے کمائے اور ۹۸۶۱ روپے انکم ٹیکس ادا کیا۔ اس آمدنی کا تجزیہ کچھ یوں ہے۔

وکالت سے آمدنی	۱۰۰۷۴ روپے
کتابوں سے آمدنی	۶۲۹۶۷ روپے
یونی ورسٹی سے آمدنی	۳۴۷۳۱ روپے

ڈاکٹر اقبال کی فائل میں صرف بائیس سال کا حساب موجود ہے۔ جس میں آپ نے صرف انیس برس وکالت کی اور اس سے تقریباً ایک لاکھ روپے کمائے جنھیں موجودہ حالات میں ۱۵ لاکھ روپے سمجھنا چاہیے۔

ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''علمی شخصیات کی تشکیل میں اساتذہ اہم کردار ادا کرتے ہیں چناں چہ اس لحاظ سے اقبال واقعی خوش قسمت تھے کہ انھیں اپنے وقت کے جید عالم سید میر حسن (پیدائش ۱۸/اپریل ۱۸۴۴ء وفات ۲۵/ستمبر ۱۹۲۹ء) سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ میر حسن عربی اور فارسی میں سند کا درجہ رکھتے تھے اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اقبال میں فارسی شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق پیدا کیا۔ لاہور واپس آنے پر پروفیسر تھامس آرنلڈ سے فلسفہ پڑھا۔ پروفیسر آرنلڈ وہی ہیں جو پہلے علی گڑھ میں تھے اور جن سے شبلی نے بھی بہت کچھ سیکھا۔ پروفیسر آرنلڈ کے علاوہ پروفیسر میک ٹیگرٹ، پروفسر براؤن اور پروفیسر نکلسن سے بھی علم حاصل کیا۔ پروفیسر نکلسن نے اقبال کو مغرب سے روشناس کرایا۔ حرکت و

عمل سے اقبال کی دلچسپی کے ضمن میں مولانا صلاح الدین نے ایک نئی بات کہی ہے۔ 'از بسکہ زندگی عبارت ہے حرکت و حرارت سے اور یہی دو قوتیں شاعرِ مشرق کے کلام میں بڑی شدت اور کثرت سے جلوہ آرا ہیں۔ اقبال نے اپنی زندگی میں کم و بیش ۲۵۰۰۰ ہزار اشعار کہے ہیں۔ کم از کم بیس ہزار اشعار ان کے کلام میں حرکت و حرارت کی صدہا کیفیات کے آئینہ دار ہوں گے۔''

آیئے اقبال کی تصانیف کا جائزہ لیں:

۱۔ علم الاقتصاد ۱۹۰۳ء، ۲۔ اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء، ۳۔ رموزِ بے خودی ۱۹۱۸ء ۴۔ پیامِ مشرق ۱۹۲۲ء،
۵ بانگِ درا ۱۹۲۴ء، ۶۔ زبورِ عجم ۱۹۲۷ء، ۷۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (انگریزی خطبات) ۱۹۳۰ء
۸۔ جاوید نامہ ۱۹۳۲ء، ۹۔ بالِ جبریل ۱۹۳۵ء، ۱۰۔ ضربِ کلیم ۱۹۳۶ء، ۱۱۔ پس چہ کرد اے اقوام شرق
۱۲۔ ارمغانِ حجاز ۱۹۳۸ء (انتقال کے بعد) ۱۳۔ فلسفۂ عجم (ترجمہ ۱۹۴۴ء)

ڈاکٹر اقبال کی زندگی کا روشن ترین پہلو یعنی حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت سے مالا مال ہونا ہے۔ وہ بیک وقت حضرت مجدد الف ثانیؒ، مولانا جلال الدین رومی، حضرت پیر جماعت علی شاہ، حضرت پیر میر علی گولڑہ شریف سے بے حد متاثر تھے۔ انھی بزرگانِ دین کی تعلیمات اور نگاہوں کے طفیل وہ محبتِ رسولؐ میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان کی زندگی کے آخری پندرہ برس کتاب الٰہی قرآن مجید فرقان حمید اور صاحبِ کتاب سید الابرار صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں بسر ہوتے تھے۔ جہاں قرآن اور صاحب قرآن کا ذکر آتا تو ڈاکٹر اقبال کی آنکھیں نہ صرف نمناک ہو جاتیں بلکہ وہ ہچکیوں کے ساتھ روتے جو ان کے عشق خداوندی اور دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی کا پتا دیتے۔

رئیس احمد جعفری کی مشہور کتاب ''اقبال اور عشق سول'' میں متعدد واقعات کی معرفت فاضل موصوف نے اقبال کی داستان عشقِ رسول کے حوالے سے دلچسپ اور روح پرور انکشاف کیے ہیں جس سے محبانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایمان کو تازہ کر سکتے ہیں۔ میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ اقبال کو اقبال بنانے میں اصل کمال عشق مصطفوی ہے کہ اُنھیں عزت، شہرت، توقیر اور بے پناہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ آج اُن کے وصال کو تقریباً ستر سال گزر گئے ہیں مگر اقبال پر آج بھی کتابیں تحریر کی جا رہی ہیں جو ان کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

کیفی حسینی☆

فکرِ اقبال کا وارث

اردو شاعری کا یہ عجیب وغریب پہلو ہے کہ اس میں ابتدا ہی سے لب ورخسار، گل وبلبل، آہ وفغاں، ہجر وصال اور قصائد ملتے ہیں جو کہ بادشاہوں، رؤسا اور امراء سے داد و دہش اور حصول منفعت کی خاطر لکھے گئے۔ اگر کہیں کچھ عوامی انداز کی شاعری ملتی بھی ہے تو وہ نظیر اکبر آبادی کے یہاں ہے۔ انھیں ہم عوامی شاعر کہہ سکتے ہیں۔

ایک ایسی شاعری جس میں قارئین اور سامعین اپنے لیے افادیت کا پہلو دیکھتے ہیں وہ اکبر الہ آبادی کے یہاں پائی جاتی ہے۔ نثر کی دنیا میں سرسید احمد خان نے اپنا رنگ جمایا اور ثابت کیا کہ ان کے دل میں ملک وملّت کا درد ہے۔ اکبر الہ آبادی کا طنزیہ ومزاحیہ پیرایہ ملاحظہ فرمائیں جس میں ملک وملّت ہی کی اصلاح کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

رپٹ لکھوائی یاروں نے جا جا کر یہ تھانے میں
کہ اکبر کے نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

یا پھر دیکھیے:

بے پردہ کل جو نظر آئیں چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہتے ہیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

یہاں یہ بات نہایت قابلِ غور ہے وہ یہ کہ اکبر نے یہ تینوں شعر اس وقت کہے ہیں جب کہ برصغیر پر انگریزوں نے اپنا پورا تسلط قائم کر دیا تھا۔

دراصل قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں ملکی وقومی تاریخ کے ہر ورق پر اس طرح ثبت ہیں کہ ہم انھیں بھولنا چاہیں بھی تو نہیں بھلا سکتے۔ خواہ وہ دورِ جہالت کی تاریخ ہو کہ ترقی یافتہ دور کی۔ خصوصاً عربوں کا وہ دور جہالت یعنی قبل اسلام جس میں قبائلی

☆C-1، دشت یار اپارٹمنٹ، مین یونی ورسٹی روڈ، کراچی

جنگوں نے عربوں کے خوں کو ارزاں تر کر دیا تھا اس عہدِ تاریک کے حالات و واقعات کو ہم تاریخ کے سیاق وسباق کے حوالے سے، دیکھنا، پرکھنا اور جانچنا چاہیں تو ہمیں اس عہد کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنا پڑے گا۔

ہماری اردو شاعری کا یہ ایک المیہ ہے کہ عرب شاعری خصوصاً جہالت کی شاعری کے سرچشمۂ الہام وتوانائی سے کسی طرح سیراب نہیں ہوئی۔ عرب شعرا کے ہاں عشق ومحبت کے عناصر نہ صرف موجود ہیں بلکہ دوسری زبانوں کی شاعری سے کچھ زیادہ ہی ہیں، اس کے باوجود عرب عاشق کی شان ہی کچھ نرالی ہے کہ وہ بزم ورزم دونوں کا مردِ میدان ہے۔ اس کی شاعری قنوطیت زدہ نہیں اور نہ ہی بیمار ذہن کی پیداوار ہے، وہ بیدار ذہن وفکر کا مجسم نمونہ ہے، اس نے جہاں عشق ومحبت کے عنصر کو اپنی شاعری میں سمویا ہے وہیں وہ میدانِ کارزار کا مردِ مجاہد وشہید محبت بھی ہے۔

کاش ہماری اردو شاعری بھی اپنی قنوطیت اور بے مقصدیت کے خول سے اپنے وجود کو آزاد کرالے تو ہماری شاعری میں بھی اقبال اور اکبر ورحمٰن کیانی جیسے صاحبِ فکر ونظر شاعر پیدا ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔

علامہ نے ایک جگہ فرمایا:

بہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

معاف فرمایئے کچھ تلخ حقائق نے قلم کی روانی کو نفسِ مضمون سے دور لے جانے کی سعی کی لیکن میں پھر نفسِ مضمون کی طرف آتا ہوں۔ بات اقبال کے فکری وارثت سے چلی تھی اور کرامت کے مکتب و فیضان نظر تک آئی۔ میرے نزدیک رحمٰن کیانی مرحوم فکر اقبال کے وارث ہیں۔

رحمٰن کیانی کی شاعری میں جا بجا پیام اقبال کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ گویا ان کی شاعری کلام اقبال کے عملی اور حرکی پہلو کی تفسیر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ وارثِ اقبال خود سپاہی ہے، جنگوں میں لڑا ہے اور ہر مسلمان کو سپاہی دیکھنا چاہتا ہے اس کے کلام کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو ماضی کی عظیم الشان روایات کی طرف بلائے تاکہ وہ یک جان اور یک دل ہو کر اس نصب العین کے حصول کے لیے کمربستہ ہو جائیں جو اسلام نے ساری انسانیت کے سامنے رکھا۔

کیانی کی ملک گیر شہرت کا آغاز ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد ان کی رزمیہ نظموں کے سبب ہوا۔ کیانی کے خاندان کا علمی اور دینی تعلق علمائے فرنگی محل لکھنؤ سے ہے اس لیے ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت ان کے والد بزرگوار مولوی حافظ محمد عبدالحق کی ذاتی نگرانی میں ہوئی جو فرنگی محل کی درس گاہ کے اعلیٰ استاد تھے اور فارسی وعربی کے جید علما میں سے۔ یہی وجہ ہے کہ کیانی کو جو دونوں زبانوں سے شغف رہا وہ اسی مکتب کی کرامت و فیضان نظر کا نتیجہ ہے۔ عربی وفارسی کی تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی۔

فطرت نے کیانی کو ذوقِ لطیف کے ساتھ سپاہیانہ عزم وعمل سے بھی نوازا تھا جس کے نتیجے میں وہ صرف اٹینشن والے سپاہی نہیں تھے بلکہ اس عطائے خداوندی سے انھوں نے وہ کام لیا جس کا تقاضا ان کی تعلیم وتربیت ان سے کرتی تھی۔ وہ خود ایک سپاہی تھے

جنگوں میں عملاً لڑے اور ان کی تمنا تھی کہ وہ ہر مسلمان کو رزم و بزم کا مردِ مجاہد دیکھیں۔

کہنے کو موصوف کا تعلق لکھنؤ کی ادبی سرزمین سے ضرور تھا لیکن نہ لکھنوی نزاکت تھی نہ نرم و نازک لب و لہجہ، نہ کلام میں لکھنوی ابہام تھا نہ قنوطیت۔ ہاں زبان و بیان کی روانی میر انیس و دبیر کی یاد ضرور دلاتی ہے۔ جب ہم نے فکر کی آنکھوں سے کیانی کی نظموں کو دیکھا پرکھا تو محسوس ہوا کہ فکرِ اقبال کا لب و لہجہ شعوری یا غیر شعوری انداز میں اقبالیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہی ملت کا غم، ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کا نوحہ، مسلمانوں کی بے راہ روی پر قلب و نظر بے چین۔ کلام سیدھا سادا۔ مگر سپاہیانہ طرز تکلم کے ساتھ، قومی بے حسی پر طنز مگر قوم کو پیغامِ بیداری کے ساتھ، اپنی نظم ''مسجدِ اقصیٰ'' میں مسلمانانِ عالم کو جھنجھوڑنے، غیرت دلانے کا انداز ملاحظہ فرمایئے:

چھینیں یہود رہروِ معراج کا پڑاؤ
اور بیربل کی طرح سے تم کھچڑیاں پکاؤ
یا سازشوں کا روز نیا ایک گلا کھلاؤ
سب برملا کہیں گے برا لاکھ تم مناؤ
یک جا نہ ہو سکیں جو محمد کے نام پر
لعنت خدا کی ایسے خواص و عوام پر

کیانی، اتحادِ عالم انسانی کو مسلمانوں کی بقا اور ترقی کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ سید جمال الدین افغانی کی تحریک کی اہمیت و ضرورت پر بار بار زور دیتے ہیں انھوں نے کہا:

میری بری بھلی کا نہ مانے کوئی برا
دریا سے موج موج سے قطرہ نہیں جدا
مجرم کہوں کا سب کی طرح میں بھی برملا
صہیونیت کو قبلۂ اوّل کی آگ کا
لیکن جو بات سچ ہے وہ بین السطور ہے
یہ قوم کے نفاق کا سارا قصور ہے

وہ اپنی نظم ''جنگ نامہ'' میں بھی مسلمانانِ عالم کو ان کی زبوں حالی پر اس طرح غیرت دلاتے ہیں۔

پھیلا ہوا ہے ملتِ بیضا میں انتشار
بے جا تصورات کی ہر قوم ہے شکار
گھر میں نہیں چھدام مگر شوق بے شمار
مضراب بھی ادھار ہے تلوار بھی ادھار

ڈفلی بھی اپنی اپنی ہے اپنا ہی راگ ہے
تھوڑی بہت ہر ایک کی آپس میں لاگ ہے
کہنے کو رہ گیا ہے کہ محمود اور ایاز
پڑھتے ہیں ایک ساتھ ابھی عید کی نماز
اس کے سوا یہ رسمِ اخوت سے بے نیاز
اتنے بٹے ہوئے ہیں کہ ازراہِ امتیاز
زردار گھر بناتے ہیں محروم سے الگ
حاکم کی قبر ہوتی ہے محکوم سے الگ

کیانی کے کلام میں ندرتِ الفاظ اور بھرپور تاثر کا حسین امتزاج ہی نہیں بلکہ وہ زورِ خطابت وقوت ہے کہ سننے والا فوری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب وہ کسی واقعے سے متاثر ہوتے ہیں تو اپنے تاثرات کو دلکش و پُراثر الفاظ کے ذریعۂ شاعری کا جامہ پہنا دیتے ہیں اپنے الفاظ کی تائید میں چند اشعار پیش ہیں نمونے کے طور پر:

ہم آسماں پاک کے شاہین و شاہ پر
رکھتے نہیں کسی سے کوئی دشمنی مگر
آمادۂ فساد جو ہو جائیں اہلِ شر
ڈالیں ہمارے ملک کی جانب بری نظر
پھر ہم قسم خدا کی مجسم عتاب ہیں
اک قہر میں بلا ہیں غضب ہیں عذاب ہیں

کیانی کی نظم ''جنگ نامہ'' کہتے ہیں کہ تقریباً دو سال میں مکمل ہوئی یہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے جذبۂ حب الوطنی اور مدافعت کو زندہ و برقرار رکھنے کا یہ ایک شعوری کارنامہ ہے۔ کیانی کو چوں کہ اس موضوع سے گہری دلی وابستگی رہی ہے اس لیے اپنے وارداتِ قلبی اور اپنی فوج سربلندی کی بہادری کے کارناموں کو شعر کے قالب میں منتقل کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی غیبی طاقت نے ان کے زور بیاں کو دو آشتہ بنا دیا ہے۔

لہجے میں سپاہیانہ اعتماد، بھرپور جوش، ولولہ اور اس کے ساتھ ساتھ کلام میں عظمت الفاظ کا زیر و بم اور روانی کا موجود ہونا ان کے قادرالکلامی کی دلیل ہے۔ جن میں افواجِ پاک کی دلیری اور جانبازی کو جس فنکارانہ انداز میں کیانی نے پیش کیا ہے وہ کسی طرح بھولنے کی چیز نہیں:

مردانِ پاک ضیغم و اژدر کہیں جنھیں
خنجر کی آبِ تیغ کا جوہر کہیں جنھیں
غصے کی تپ، غیظ کا پیکر کہیں جنھیں
یا شان ذوالجلال کا مظہر کہیں جنھیں

جنگل کی آگ بن کے چلے جب پہاڑ سے
لاوے کی طرح پھوٹ پڑے ہر دراڑ سے

چل کر پہاڑیوں سے بصد ہیبت و حشم
تنظم عسکری میں بلائے ہوئے قدم

آگے بڑھے جو فخر عرب نازش عجم
ایسا لگا قطار سے گرنے لگے ہیں بم

یا کوہ کن پہاڑ پہ گھن مارنے لگے
یا اژدہے زمین پہ پھن مارنے لگے

گزری جدھر سے فوج خداوند ذوالجلال
پایا زمین نے اوج فلک ہو کے پائمال

پنجہ کہیں لگا تو بنی بدر کی مثال
ایڑھی جہاں جما کے رکھی بن گیا ہلال

ٹھوکر کہیں لگی تو شرارے بکھر گئے
قدموں پہ غازیوں کے ستارہ بکھر گئے

کیانی نے نہ صرف اردو شاعری کو اپنے رزمیہ کلام سے مالا مال کیا بلکہ انھوں نے نعت کے قدیم روایتی انداز و مضامین کو بھی ایک نئے موڑ سے آشنا کیا۔ میرے الفاظ کی تائید میں نعت کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں۔

لوگو! سنو جنابِ رسالت مآب میں
شانِ رسول صاحب سیف و کتاب میں
ماحی لقب، نبی ملاحم کے باب میں
کرتا ہوں فکرِ مدح کو جوشِ خطاب میں
مصرعہ زباں پہ آتا ہے زورِ کلام سے
تلوار کی طرح نکل کر نیام سے

نعتِ رسول کا یہ طریقہ عجیب نہیں
سمجھیں عوام داخل حدِ ادب نہیں
لیکن یہ طرزِ خاص برائے سبب نہیں
شیوہ سپاہیوں کا نوائے طرب نہیں
رائج ہزار ڈھنگ ہوں ذکرِ حبیب کے
شاہین سے مانگیے نہ چلن عندلیب کے

جب بھی سپاہیوں سے پیمبر کو پوچھے
خندق کا ذکر کیجیے خیبر کو پوچھے

بدر واحد کے قائد لشکر پوچھے
یا غزوۂ تبوک کے سرور کو پوچھے
ہم کو حنین و مکہ و موتہ بھی یاد ہیں
ہم امتی بانیِ رسم جہاد ہیں

نعت گوئی یہ اندازِ فکر کا یہ البیلا پن کیانی سے پہلے اردو نعت میں کہیں نہیں ملتا۔ اگر چہ حالی نے مدو جزر اسلام لکھ کر سرسید اور قوم سے دادِ تحسین ضرور حاصل کی وہ بھی قدیم روایتی انداز لیے ہوئے ہے۔

تحریک پاکستان کا یہ سپاہی جب یہ کہتا ہے:

مردانِ باوقار و خواتین محترم
لے کر خدا کا نام اٹھاتا ہوں پھر قلم
جس کی عنایتوں سے ہمیں قوم کا علم
بخشا گیا ہے آج یہی جان کر کے ہم
بے خوف ہیں جری ہیں غیور و دلیر ہیں
جانباز و جاں نثار میں شیروں کے شیر ہیں

تو ملتِ اسلامیہ کے ماضی کی پوری تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ خواہ وہ بدر حنین کے معرکے ہوں کہ جنگ موتہ جس میں ہمارے اسلاف نے ملت بیضا کے لیے، حق کی سربلندی کے لیے وہ محیر العقول کارنامے انجام دیے جس کی نظیر آج کی ترقی یافتہ دنیا میں پیش نہ کر سکی۔

فکر اقبال کو کیانی نے کس طرح استعمال کیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

قصہ جو کبھی جنگِ ستمبر کا چھڑا ہے
غنچہ کہیں مہکا ہے کہیں پھول کھلا ہے
سورج کہیں اُبھرا ہے کہیں چاند چڑھا ہے
اقبال کے الفاظ میں لوگوں نے کہا ہے
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

الحمد اللہ مگر وقت پڑا جب
اور تم نے دکھائے فن پرواز کے کرتب

اقبال کے شاہین کا ہر انداز پر اک ڈھب
لوگوں نے کہا جھوم کے معلوم ہوا رب
ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

دیکھا آپ نے ان دو بندوں نے تاریخ کے کتنے ہی گوشوں کی یاد دلا دی۔ وہ سترہ سالہ سپہ سالار محمد بن قاسم ہو کہ، غزنی کا محمود جس کے نام سے آج بھی سومنات کے در و دیوار لرز اُٹھتے ہیں۔ شہاب الدین غوری ہو کہ بابر صاحب قراں الغرض کہاں تک تاریخ ماضی کے اوراق الٹے جائیں۔

لیکن عزیزانِ گرامی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف کے یہ محیّر العقول کارنامے اور وہ تمام عظیم فتوحات انھوں نے کیسے حاصل کی تو سنیے اقبال کی زبان سے وہ قادر مطلق و خالق کل کیا فرماتا ہے:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

جی ہاں! یہی وہ جذبۂ ایمانی ہے جوان تین سو تیرہ میں تھا۔ وہ وفا کے پیکر تھے۔ وہ اتباع رسول کو حرز جاں بنائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی تقدیر آپ لکھتے تھے۔ وہ مردِ میدان تھے۔ اور ہم تالین کے شیر ہیں۔

اصل میں بات ''فکرِ اقبال کی وراثت'' کی ہو رہی تھی، اسی حوالے سے رزمیہ شاعری اور کیانی کے کلام میں پیام اقبال کی بازگشت کا آنا گویا فطری عمل تھا اور ہے کہ کیانی بھی اقبال کی طرح دردمند دل لیے ہوئے پیدا ہوئے تھے۔ اسلام اور بانی اسلام سے انھیں بے حد محبت تھی۔ اس سے وہ غیرت، فتوح، ہمت، ایمان افروزی اور جہانبانی کی مثالوں کو اپنی شاعری میں سموتے رہے اور انھوں نے فکرِ اقبال کے فکری عمل وح کے پہلو کو تفسیر کی زبان عطا کی۔

کیانی خود سپاہی تھے اسی لیے ان کے کلام میں سپاہیانہ پر اعتمادی ولولہ، جوش ایمانی کے ساتھ موجود ہے، لفظوں کا صحیح برتاؤ، اور عظمت ان کے کلام میں بول پڑتی ہے، لہجے کی کاٹ، ندرتِ الفاظ کی سادگی برجستگی کے ساتھ ان کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

نہ اقبال ہی باقی رہے نہ ان کے بعد قوم و ملت کو بیدار کرنے والا۔ لیکن ان کے پیغام، ان کی حریت پسندی، ان کا جذبہ ایمانی آج بھی زندہ و تابندہ ہے اور آنے والے کل بھی زندہ و تابندہ رہے گا اور انشاء اللہ آنے والی نسلیں ان کے کلام سے مستفید ہو کر ان کے پیغام سے درس عزم و عمل ضرور حاصل کریں گے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

غلام باغ — ناول آف دا ایبسرڈ

تھیٹر آف دا ایبسرڈ Theatre of the Absurd کے متعلق ادب سے متعلق لوگ جانتے ہیں کہ یہ ڈراما کی وہ شکل ہے جس میں محیرالعقول، نرالی اور عجیب وغریب اور مضحکہ خیز صورت ہائے احوال کے ذریعے زندگی کے المیوں اور لایعنیت کی عکاسی کی جاتی ہے۔ ایک زمانے میں اس تھیٹر نے یوروپ میں اپنا اثبات کرایا تھا۔ تھیٹر کی حیثیت سے یہ ہمارے یہاں ناپید نظر آتا ہے۔ تھیٹر آف دا ایبسرڈ کی تاریخ کی تفصیل میں جانا یہاں تضیع اوقات ہوگا بس اتنا سمجھ لیا جائے کہ فلسفے کے پروفیسر مرزا اطہر بیگ(۱) نے ''غلام باغ'' کی شکل میں ناول آف دا ایبسرڈ کا ہمارے یہاں ایک ایسا تجربہ کیا ہے جسے بھلایا نہیں جاسکے گا۔ اس ناول کو پڑھنے کے بعد راقم الحروف کو کم از کم یہ ہی خیال آیا تھا۔ اس ضمن میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مرزا اطہر بیگ نے واقعات، مکالموں اور خودکلامی کی ایک ایسی دنیا سجائی ہے کہ جس کا سجانا ایک مشکل امر تھا اس لیے کہ ابتدا سے لے کر اختتام تک مضحکہ خیز ومحیرالعقول واقعات اور کسی اور سیارے کے لوگوں کے مکالمات کی دلچسپ دروبست کو روایتی ہیت سے بچتے ہوئے نئی اسلوبیاتی شکل دینا کہ جس میں معانی بھی برآمد ہوں اعلیٰ فن کاری ہی کی دلیل ہے۔

غلام باغ کیا ہے؟ یہ آثارِ قدیمہ سے متعلق مصنف کے تخیل کی پیداوار ہے جس میں کیفے باغ بھی ہے جہاں اس فلسفیانہ ناول کے اہم ترین کردار کبیر مہدی، (جو فلسفیانہ الفاظ اگلتا ہے بلکہ اس کا منبع ومخرج ہے اور مصنف کا ماؤتھ پیس Mouth Piece نظر آتا ہے) ڈاکٹر ناصر نیورولوجسٹ، زہرہ، جو طاقت کی بحالی کی دوائیں دینے والے حکیم یاور عطائی کی تعلیم یافتہ ذہین بیٹی ہے اور جو باپ کے ڈرائنگ روم میں اجتماع کرنے والے عجیب وغریب کرداروں کو دیکھ کر نفسیاتی مریضہ بن گئی ہے۔ فریڈرک ہاف میں، جو جرمن ہے اور اپنی آسٹریلوی محبوبہ گرٹ ریوڈ کے ساتھ ''غلام باغ'' پر اپنی یونی ورسٹی کے وظیفے پر تحقیقی مقالہ لکھنے آیا ہوا ہے۔ اس کیفے باغ میں عاشق علی پیراسب کی خدمت پر معمور ہے اور مدد علی ہے جسے نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے پراسرار طریقے پر غلام باغ کے تہہ خانے میں جا کر قدیم زر وجواہر اور سونے کے سکّے نکالنے پر مامور کیا ہوا ہے۔ غلام باغ کے حدودِ اربعہ کے لیے ناول کی آغاز میں یہ تفصیل ملتی ہے:

''اگرچہ کیفے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ اس سے مرعوب ہوا جاتا بلکہ غلام باغ کے ایک کونے میں

واقع ہونے کی وجہ سے تو بعض اوقات وہ سستا سا چائے کا ہوٹل بھی عہد رفتہ کی ایک برباد شدہ باقیات دکھائی دیتا تھا اور گمان ہوتا تھا کہ اگر مغل شہزادیاں نہیں تو کسی انگریزی پلاٹون کے ٹامی سپاہی ادھر چائے بلکہ شراب نوشی تو ضرور کرتے رہوں گے۔

نشہ پانی کرنے والے دراصل کیفے غلام باغ کے معمول کے دیگر گاہکوں سے مرعوب ہوتے تھے یونی ورسٹی اور میڈیکل کالج کے طالب علم ریڈیکل قسم کے دانشور اکثر یہاں بیٹھتے تھے۔ایک زمانہ تھا جب غلام باغ کو بڑے شہر کے مضافات میں واقع آثار قدیمہ میں شامل کیا جاتا تھا لیکن پھر جب بڑا شہر اور بھی بڑا ہوتا گیا اور جرنیلی سڑک کے کنارے واقع غلام باغ کے گرد ونواح میں علم وفن کی تدریس کے ادارے تجارتی عمارتیں اور دیگر آبادی بڑھنے لگی تو ''غلام باغ'' پوری طرح شہر کی لپیٹ میں آ گیا اور مضافات پیچھے ہٹتے چلے گئے۔''(۲)

اس کے لیے یہ بھی بتایا گیا ہے غلام باغ، عالمی ثقافت کے زمرے میں آ گیا اور بیرونی عناصر بھی یہاں بیٹھنے لگے اور اس کی حیثیت آثارِ قدیمہ کے ایک حیرت انگیز نمونے اور ''عجب معمہ'' کی سی ہوگئی۔

لیکن اصل ''معمہ'' وہ تمام کردار ہیں جو اس سے متعلق ہیں جن کا سرغنہ کبیر مہدی ہے۔ یہ کردار پورے ناول پر چھایا ہوا ہے اور یوں لگتا ہے گویا جو کچھ وہ اپنے ''نیلے رجسٹر'' میں لکھ رہا ہے وہ ہی دیگر کرداروں کے ایکشن کے حوالے سے متشکل ہو رہا ہے۔ وہ نہ صرف ''غلام باغ'' کے کیفے باغ کی زینت ہے بلکہ اسکالرز اولڈ بکس شاپ کے پچھتر سالہ مالک امداد حسین کے گھر میں ''گھونسلے'' نامی جگہ میں رہتے ہوئے امداد حسین کو فکری غذا بھی فراہم کرتا ہے۔ واضح رہے کہ امداد حسین رات کو بستر میں بغیر کپڑوں کے سوتے ہیں اسی لیے جب یاور عطائی کے ڈرائنگ روم (خصی کب) کے جرائم پیشہ فرد امیر جان اس کے گھر کو کبیر مہدی کو جلا کے مار ڈالنے کی غرض سے آگ لگاتا ہے تو اسے نئے کپڑے پہننے کے لیے اس ایمرجنسی میں اپنی کارروائی کرنے میں خاصا وقت صرف کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کبیر مہدی جھلس جاتا ہے اور ساتھ ہی ''نیلا رجسٹر'' بھی جھلس کر کالے رجسٹر میں تبدیل ہو جاتا ہے تاہم اس میں کچھ نہ کچھ تفصیلات باقی رہ جاتی ہیں۔ ڈاکٹر ناصر اس رجسٹر کو کسی نہ کسی طرح کبیر مہدی کے ساتھ باہر نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ ''نیلا رجسٹر'' جو کہ کبیر مہدی کی ''دلی داستان'' ہے محیر العقول، نرالی، عجیب وغریب، انوکھی وارداتوں پر مشتمل ہے۔ اس کی مثالیں دیکھیے۔ لیکن کچھ بھی خالی از علت نہیں ہے یوں محسوس ہوتا ہے گویا کبیر مہدی شعور کی رو کے تحت ایسے نکات لکھ رہا ہے جن کے پیچھے سوچ کی ایک دنیا آباد ہے۔

''پورس کے ہاتھی نسیم حجازی، مین آن ٹاپ نینسی فرائیڈے، اصول فلسفہ ہنود، پی ٹی سری نواسا،
ترجمہ احسان بی اے خود آموز فارسی پروفیسر رازی، اردو برائے لیکچرار ٹیسٹ، اسلامک سائنس،
Vol-1، سید حسین نصر، درد آشوب احمد فراز۔''(۳)

''یوگا کے اسرار پنڈت شامبو ناتھ، الفاروق شبلی نعمانی، سینس اینڈ نان سنس ان سائیکولوجی ایچ جی آئسنگ، خلافت اور ملوکیت ابوالاعلیٰ مودودی۔ ارزل نسل کی اساطیر گلبرٹ والٹن۔ مکالمات افلاطون۔'' (۴)

''ایک حسین جھگڑالو بے وقوف 'لنگڑی عورت' ایک عیار، ٹھگنا لالچی بوڑھا لنگڑا مرد ایک دریا دل بزدل، وہمی، خوش شکل لنگڑا مصور سوال کیا الف اپنے خداداد لنگڑے پن کے بل بوتے پر ب۔ج۔د۔ کے لنگڑے پن کی گہرائی میں جاسکتا ہے (پھر وہی گہرائی) ب۔ج۔د ہر ایک کی الگ لنگڑی دنیا ہے (ظاہر ہے) یہ کوئی دور کی کوڑی نہیں) ب۔ف۔ع۔غ۔ص۔ل مصنف ا ب ا گرل سے مراد تحریر کی صلاحیت ہے ج۔ر۔ا۔د۔گ۔پ۔ل۔ مصنف پ۔ط۔ڈ۔ل۔ مصنف۔'' (۵)

یہ صرف نمونہ ہے ورنہ ''نیلے رجسٹر'' میں درج کی گئی معلومات انتہائی دلچسپ ہیں اور غور کرنے پر ہم جان سکتے ہیں کہ ہمارا جس سطح پر جس عہد میں رہا ہے اور اس کے جتنے بھی جنون ہوا کرتے تھے، اس کی جتنی بھی مضحکہ خیزیاں ہوتی تھیں ان کا نچوڑ اور رہنماؤں عام آدمیوں اور ادیبوں کی جو ٹیڑھ ہوا کرتی تھی اور ہماری تاریخ میں جو ہماری مجموعی سیاسی، اخلاقی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی کمزوریاں رہی ہیں ان کا مجموعی تاثر ان تحریروں سے ہم پر واضح ہو جاتا ہے ان سب کے لیے ہم اپسر ڈٹی اور لایعنیتِ زیست کے الفاظ استعمال کرسکتے ہیں۔ اس سے ملتی جلتی تحریریں فہیم اعظمی کے ناول ''جنم کنڈلی'' میں بھی ہیں لیکن وہ اتنی گہرائی سے خالی ہیں جس کا خلاقانہ تحریری مظاہرہ مرزا اطہر بیگ نے کیا ہے اور ایسی زبان میں کیا ہے جس پر یہ پوچھنے کو طبیعت چاہتی ہے کہ ''آخر ایسی جدید مرصع زبان جو اپسر ڈٹی اور لایعنیت کی عکاسی کرتی ہے آپ نے کیسے سوچ لی اور کس طرح آٹھ سو اٹھہتر صفحات پر پھیلا دی؟'' اس دلچسپ زبان کو عبداللہ حسین نے اپنی فلیپ کی رائے میں ''تنومند'' قرار دیا ہے اور یہ بھی پوچھا ہے کہ شیطان کی آنت کی مانند لمبی کہانی کے سروں کو ضبط میں رکھنے کے ٹینشن نے اس کی جسمانی اور ذہنی صحت پر کیا اثر ڈالا ہوگا؟ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ناول کی کہانی ایک ایسے شیشے کی مانند ہے جو چاروں جانب گھوم رہا ہے، کبھی اس میں جنگل کا عکس آتا ہے، کبھی بے کنار سمندر اور چاند ستاروں کا نظارہ ملتا ہے اس ''پیسا بائیسکوپ'' کی طرح جس سے بچپن میں ہم آنکھ لگا کر شوخ رنگ شیشوں کی مختلف بنتی ہوئی شکلیں اور بمبئی کی سیر اور بارہ من کی دھوبن دیکھا کرتے تھے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ عبداللہ حسین جیسے بڑے ناول نگار کی اس رائے کو حوالے میں دی گئی باتوں سے ملا کر دیکھنے سے قارئین کو اس ناول کی لسانی و تخلیقی خوبیوں کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اب چوں کہ بات کبیر مہدی کے نیلے رجسٹر کے حوالے سے ہو رہی تھی تو یہ اسی جگہ پر بتا دیا جائے کہ ایسا کردار زیادہ عرصے زندہ نہیں رہتا۔ کبیر مہدی جیسا ڈائجسٹ کا ادیب جس کے جگر میں عہد جدید اور ماضی

کے ادوار کے تمام درد سمائے ہوئے تھے آخیر میں مارا جاتا ہے ایک بار تو وہ امیر جان کی لگائی ہوئی آگ سے ڈاکٹر ناصر اور زہرہ کی مدد سے بچ نکلتا ہے لیکن دوسری بار وہ مارا جاتا ہے۔ اس کا زندہ دکھایا جانا ناول کے ماجرے کے ساتھ ناانصافی بھی ہوتا۔ معروف نقاد سہیل احمد خان نے اپنی فلیپ کی رائے میں لکھا ہے کہ نوآبادیاتی دور سے نکلنے کے بعد چاروں طرف سے گھیرتے ہوئے بڑے بڑے جال، ان میں گرفتار خلقت کا اضطراب اور انتشار اور اس انتشار میں زندگی کی معنویت کی تلاش کو بے سور کاوشیں۔ یہ سب کچھ اس ناول کا ''پوسٹ کولونیل'' "Post Colonial" دائرہ متعین کرتا ہے۔ اس صائب رائے کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کبیر مہدی اتنے زبردست انتشار اور اضطراب کا بوجھ نہیں سہار سکتا تھا اس لیے اس کا قصہ ہو گیا اور آخیر میں ڈاکٹر ناصر اور زہرہ ہی رہ گئے جو لگتا ہے کہ ایک دوسرے ہی کے لیے تخلیق کیے گئے تھے۔

اب آیئے زہرہ اور ڈاکٹر ناصر کی اپنی اپنی کہانیوں سے نمٹیں۔ زہرہ کا باپ یاور عطائی، انعام گڑھ کی ارزل نسلوں میں سے ایک تھا جو اپنے باپ کی جانب سے دیے گئے اس دستاویزی نسخے کو حاصل کر لیتا ہے جو باپ نے ایک حکیم کو نہیں پہنچایا تھا، وہ ایک ارزل نسل کا ڈاکیا ہوا کرتا تھا اور جانتا تھا کہ پڑھے لکھے یاور کو اگر ''گنجینۂ نشاط'' کا نسخہ مل گیا تو اس کی آنے والی نسلیں مالی طور سے مستحکم ہو جائیں گی۔ ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں، ان کا مسئلہ ہے کہ کسی طرح جوان ہی رہیں، کیوں کہ عورت ان کا مسئلہ ہے اور صرف یاور عطائی ہی ان کا آخری سہارا ہے اسی لیے وہ اس کے خفیہ ڈرائنگ روم (خصی کلب) میں آتے ہیں۔ ناول میں سیکس کا بھی ذائقہ ہے۔ مگر مبتذل جذبات والا نہیں۔ یہ مواد کے اعتبار سے اینٹی سیکس Anti-sex کا معاملہ نظر آتا ہے۔ ڈرائنگ روم کے افراد دیکھیے:

> ''پچیس تیس مرد بیٹھے ہوئے کھڑے ہوئے تنے ہوئے، سیاست دان، تاجر صنفعت کار، بیورو کریٹ، اخبار نویس، عالم، پروفیسر، جج، ریٹائرڈ فوجی، ادیب، شاعر، زمین دار، جاگیردار، اسمگلر، وکیل، سیاست دان، اور یہ سب دنیائیں آپس میں مدغم ہو کر وہ دنیا بناتی ہیں جو یاور عطائی کے ڈرائنگ روم کی دنیا ہے۔''(۶)

ڈرائنگ روم کا ایک کردار وہاں رکھے مرتبانوں کو کھولنے لگتا ہے۔ یہ الیاس پُگل ہے۔ اسے ان میں خاص ہیولے نظر آتے ہیں۔ چھوٹے بڑے، سکڑے ہوئے ٹیڑھے، سیدھے، ہارے ہوئے تھکے ہوئے، تنومند، بے تاب، بے صبرے، شرمیلے، شریف، بااخلاق، غصیلے، عاجز، انتہا پسند، معاملہ فہم، صابر، قناعت پسند، لاغر، نیلے، پیلے، کالے، سفید، مفکر، آزردہ، خوش طبع، جلد باز، جامد، مفکر، متحرک، منفرد، خاندانی، رذیل، کم ذات، نسلی، اصلی، نقلی، محبِ وطن، غدار، سیاسی، فوجی علمی، ادبی، قومی، صوبائی، عوامی، جمہوری، دردمند، بے درد، ترقی پسند، دور اندیش، کوتاہ اندیش، دانشور، علاحدگی پسند، وحدت پسند، اپنے، بیگانے، انجانے، جانے پہچانے، جھوٹے، دوغلے، منافق، عیار، مکار، فن کار، زندہ، مردہ، نیم مردہ، زخمی، کرشماتی، روحانی، غم ناک، دہشت گرد، جہاں گرد، فریبی، بہروپیے، بے چارے، بدنصیب، لاعلاج، بے خبر، بے خطا، بے خود، بے خوف، بے داغ، بے دخل، بے اختیار، بے اصل، بے انداز، بے ایمان، بے باک، بے بس، بے بہرہ، بے پردہ، بے تحاشا، بے تکلف، بے جوڑ، بے دریغ، بے راہ، بے ربط، بے ریش، بے زبان، بے ساختہ، بے

عقل، بے غرض، بے غیرت، بے فکر، بے قابو، بے فیض، بے قدر، بے قرار، بے کار، بے کس، بے کل، بے گھر، بے لاگ، بے لحاظ، بے لطف، بے لگام، بے نیاز، بے نظیر، بے وفا، بے وقت، بے ہنگم بے ہوش، بے مثال، بے شمار... بے۔ بے۔ بے۔ بے۔(۷)

قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حفیہ ڈرائنگ کے اتنے اوصاف کے حامل افراد جو یاور عطائی کے ڈرائنگ روم میں مختلف ٹکڑیوں میں آتے ہیں اور اپنی پراسرار سرگرمیوں کا اس کی سربراہی میں مظاہرہ کرتے ہیں ان کا ڈرائنگ روم کے دوسرے طرف مقیم زہرہ پر کیا اثر ہوتا ہوگا۔ اس کی ماں اور بھائی کسی اور جگہ رہتے ہیں اور یاور عطائی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اس کی باغی ماں کہتی ہے کہ یاور عطائی نے جھوٹ بول کر یعنی اپنی ارزل حیثیت کا چھپا کر اس سے شادی کی تھی۔ لیکن زہرہ کا مسئلہ یہ ہے کہ اپنی جڑوں Roots تک پہنچا جائے۔ ایک بار وہ کبیر مہدی جیسے سر پھرے دانشور اور نام نہاد فلسفی جو عصری ڈائجسٹ میں عجیب وغریب فکشن اس کے ایڈیٹر نجم الثاقب کے حکم کے تحت لکھتا ہے کے ساتھ جا کر ارزلوں کے مقام انعام گڑھ ہو بھی آئی تھی جہاں کا استحصالی اور مضحکہ خیز کلچر وہیں کا وہیں تھا البتہ ان کے جہاندیدہ آقا ان سے ووٹ لے کر اپنی شان بڑھانے والے وہاں خوب دندناتے پھر رہے تھے۔ یہ زمین کے وارث اور مالک ہی نہیں ارزل نسلوں کے مالک بھی بنے ہوئے تھے اور ارزل اپنے پاگل پن اور جہالت اور کم علمی میں ان کی چاکری کر رہے تھے۔ یہ سناریو Scenario تو آج بھی موجود ہے۔ زہرہ کی اپنے روٹس میں جا کر بھی تشفی نہیں ہوتی، وہ ڈاکٹر ناصر اور کبیر مہدی سے کیفے باغ کے احاطے اور باہر دونوں جگہ جڑی رہتی ہے اور انسانی فطرت کے وہ وہ مظاہرے دیکھتی ہے کہ تحیر ہی میں رہنے میں عافیت محسوس کرتی ہے۔ وہ ڈاکٹر ناصر کے نفسیاتی مریضوں کے اسپتال میں مختار نرس کی حرکتوں کی بھی شاہد ہے جو پیرانائیڈ خاتون ماہ پارہ پر زیادہ تر مامور ہے۔ پیرانائیڈ اپنے شوہر کو چھوڑے بیٹھی ہے اور نفسیاتی مریضہ یا عقل کی اندھی ٹائپ کردار ہے جو مکالمے وہ بولتی ہے وہ کسی پاگل اور مجنون کے ذہن ہی میں تخلیق ہو سکتے ہیں مثلاً میں ہر رات کئی بچوں کو جنم دیتی ہوں انھیں میرے بطن میں واپس ڈالو۔ اور یہ محض ایک مثال ہے۔ یہ پیرانائیڈ عورت جو کہ ظاہر ہے کہ ظاہر کو دیکھنے سے قاصر ہے اور ایک قسم کی نابینا اور حقیقت کی دنیا کا مضحکہ خیز کردار ہے جس کے خانگی پس منظر میں جانے سے ہی اس کی حقیقت کا انکشاف ہو سکتا ہے۔

''غلام باغ'' پر ریسرچ کرنے والا جرمن کردار فریڈرک ہاف مین اپنی تحقیق کے پس منظر میں جنون ہی کی انتہا پر ہے۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ غلام باغ کے دعوے کے حوالے سے جنم کھنڈر (غلام باغ کا تہہ خانہ) کے اندر سے پرانے دفینے کے حصول کے لیے پاگل پن کا شکار ہے۔ ہاف مین آثار قدیمہ کی مہارت کا دعویٰ کرتے کرتے زلزلے کے جھٹکے آجانے کی وجہ سے ملبے کے نیچے دب کر مارا جاتا ہے۔ یاور عطائی کو بھی ان کی موت اچک لیتی ہے اور وہ طاقت کی دواؤں کے طالبوں کو بے نیل ومرام چھوڑ جاتے ہیں، جل پتھری کی کھوہ میں قیام پذیر چٹا سائیں ننگے رہنے کے باوجود تعلیم یافتہ و جاہل دونوں کے دلوں پر راج کرتے ہیں جب کہ وہ ایسی ایسی حرکات وسکنات کے لیے مشہور ہیں کہ پرانے دور میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب کو پتہ چل جاتا تو سرعام پھانسی چڑھا دیے جاتے اور یہ نہ سوچتے کہ بہتوں کے نزدیک یہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں جو خواہش مندوں کی مرادیں پوری کر دیتے ہیں۔ ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی کا یہ پہلو بھی خوب ہے! اور کہانی آگے بڑھتی رہتی ہے!

باپ کی موت کے بعد زہرہ اور ڈاکٹر ناصر کو ان پراسرار نسخوں کا راز معلوم کرنے کا جنون سوار ہوتا ہے۔ بوتلوں اور مرتبانوں میں کیا ہے؟ اسی کھوج کا پارٹ ٹو ہے جس میں کبیر مہدی، ڈاکٹر ناصر، زہرہ فریڈرک ہاف مین، نواب ثریا جاہ نادر جنگ، خوفناک مجرم امبر جان، مدد علی جو جان پر کھیل کر جنم کھنڈر میں سے اینٹیں اکھیڑ کر خزانہ برآمد کرنے پر نواب کی جانب سے مامور ہے اور جسے پرانے زمانے کا برطانوی پاؤنڈ کا ایک نادر سکہ مل بھی جاتا ہے جس کے بعد اس کی قوت گویائی ماری جاتی ہے، ایک بیوروکریٹ (جو چاہتا ہے کہ کوئی رقم لے کر اس کے لیے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ دے اور وہ اونچے منصب پر جا پہنچے) وہ خاتون جس کا شوہر چار سال سے غائب ہے، چاہتی ہے کہ کوئی اس کا مقالہ تحریر کر دے تا کہ وہ زیادہ بڑی پوسٹ حاصل کر سکے، تدریس سے ابھی آمدنی کم ہے) پروفیسر نذیر بھی موجود ہے (جو کبیر مہدی کے کم آمدنی کے شکوے کے مدنظر اسے ان لوگوں سے ملاتا ہے تا کہ وہ ان سب کے لیے مقالے لکھ کر بھاری آمدنی حاصل کر سکے) خود کبیر مہدی چاہتا ہے کہ عصری ڈائجسٹ میں لکھتے لکھتے ایک بہت بڑا ادیب بن جائے لیکن اس کا ضمیر جاگ جاتا ہے اور وہ امداد حسین کے اسکالرز اولڈ بکس شاپ کے یہاں کتابوں کی چھٹائی کے کام پر واپس آ جاتا ہے۔ یہ سب کسی خاص جنون، پاگل پن اور مضحکہ خیزی کے منصوبوں میں ملوث ہیں اور ایپسر ڈٹی کے پردے میں معاشرتی، سماجی، تہذیبی، اخلاقی اور تاریخی حقائق کی نشاندہی کر رہے ہوتے ہیں اور مصنف کا لطیف طنز Satire زیریں رو کی حیثیت سے پورے ناول میں واقعات، حادثات اور الفاظ میں سرگرم عمل رہتا ہے جس نے ناول میں جان ڈال دی ہے۔ اس میں دراصل ماجرے کی دو سطحیں ہیں، انوکھے، عجیب و غریب مضحکہ خیز، نرالے نیز حیرالعقول واقعات اور مکالمے اور کہیں کہیں داخلی خودکلامی۔ اس سے عام قاری لطف لے سکتا ہے خواہ ایپسر ڈٹی کو ذہنی طور سے کھسکے ہوئے اور کریک لوگوں کا چلن سمجھ رہا ہو لیکن اس کی دوسری سطح یہ ہے کہ جدیدیت سے مانوس قاری اس کی گہرائی میں جا کر اس کی فکری جہات کو تلاش کر لیتا ہے اور اس بصیرت یا وژن کو بھی جو اس میں پنہاں ہے۔ اس کی مثال سوئفٹ Swift کی فنتاسی Fantasy والی، تحریر دا گلیورز ٹریولز The Gullivers Travels جس میں بچوں اور نوجوانوں کے لیے دلچسپی کا بڑا مسالہ ہے لیکن ذہین قاری اور نقادوں کے لیے یہ زبردست سیاسی طنزیہ Political Satire ہے جس میں اس عہد کی سیاسی مضحکہ خیزیوں اور جنون کا تذکرہ ہے۔

''غلام باغ'' میں یہ دونوں سطحیں موجود ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس میں تمام واقعات لاشعور یا خواب کی دنیا میں وقوع پذیر ہو رہے ہیں جو پراسرار ہے اور جن میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔ یہاں ایک قسم کی شعور کی رو ہے یعنی اظہار کا وہ تجربہ جو کئی زبانیں جاننے والے ناول نگار، جیمس جوائس نے یولیسس Ulysses میں کیا ہے۔ اردو ناول کے دائرے میں اپنے لسانی تناظر میں ایسا اظہار جو مرزا اطہر بیگ نے کیا ہے وہ قابل تعریف ہی گردانا جائے گا، اس تجربے کی ابتدا اچھے انداز سے ہوئی ہے۔ اس میں کرداروں کا التباسِ نظر Hallucination چکرا دینے والا ہے لیکن حقیقی ہے کہ بہت سے لوگ ہمیشہ التباسِ نظر ہی کا شکار رہتے ہیں، یہاں لوگ ہذیان بھی بک رہے ہیں لیکن یہ ہی وہ ایپسر ڈٹی ہے جس کے کارن یہ ناول تصنیف ہوا ہے وہ بھی ایک ایسی زبان میں جو فراٹے بھرتی چلی جاری ہے، اس میں بیانات بھی ہیں، سوچیں بھی ہیں، نامانوس اور نئے الفاظ مثلاً لا۔ لکھاری، گیگلا،

فالودی، لاعلم، گبراؤ، بھوگ بلاس وغیرہ بھی ہیں۔ پرانے فلسفے بھی ہیں، مضحکہ خیز وزالی صورت ہائے احوال کا حیرت انگیز در و بست اور داخلی خودکلامیاں بھی ہیں، انسانی جنون کے مظاہر بھی ہیں جیسے کہ ہمارے سامنے It is a mad mad world نامی فلم چل رہی ہو۔ چوں کہ ''لفظ'' ہی ہمارے جذبات و احساسات کی تمام اصناف ادب میں عکاسی کرتے ہیں اس لیے اس کی نیرنگی پہلی بار دیکھنے میں آئی ہے اور حیران کر دیتی ہے کہ مصنف نے تقریباً نو سو صفحات کے اس طویل ناول میں انھیں کس طرح ماجرے کی بساط پر موتیوں کی طرح پرو دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حیران کن امر ہے کہ تمام ہی کرداروں کی نامعلوم اور ناقابل حصول کی تلاش کو کس طرح اور کس خوبصورتی سے انوکھی ناولاتی تحریر کا جامہ پہنا دیا گیا ہے!

اس ناول کے ضمن میں ایپسر ڈٹی کے حوالے سے اس نکتے کو نہ فراموش کیا جائے کہ نوآبادیاتی دور سے قبل نیز نوآبادیاتی دور کے بعد ہمارا منظرنامہ، جنون، پاگل پن، ہر معاملے میں انتہا پسندی، عدم برداشت، فضول کی جنگوں، نفرتوں، تعصبات اور ہمہ گیر انتشار سے عبارت رہا ہے اور آج کے دور کا جنون تو سب پر بازی لے گیا ہے، اس حوالے سے ناول کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر اس دنیا میں نہیں رہیں۔ شاید نقادوں کی سوچ یہ ہو کہ اس عظیم ناول نگار نے جو ناول دیے ہیں اور اردو ناول کی صنف کو توانا کیا ہے تو شاید طویل عرصے تک اس میدان میں خاموشی کا راج ہوگا تاہم ۲۰۰۶ء میں ''غلام باغ'' اور شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' سے بالخصوص ''غلام باغ جیسے ناول آف دا ایپسر ڈ سے یہ امید بندھتی ہے کہ یہاں بھی ایک اور سنگ میل عبور کر لیا گیا ہے اور زبان و بیان اور فکر و فن کے اعتبار سے یہ صنف ادب ترقی کرے گی۔

حواشی:

(۱) صہ شعبہ فلسفہ، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور

(۲) غلام باغ، مصنف مرزا اطہر بیگ، ناشر سانجھ پبلی کیشنز، مفتی بلڈنگ، ٹمپل روڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء/۲۰۰۷ء، ص ۱۶

(۳) ایضاً، ص ۳۸۵

(۴) ایضاً، ص ۳۸۶-۳۸۷

(۵) ایضاً، ص ۳۹۷

(۶) ایضاً، ص ۲۳۹_۲۴۰

(۷) ایضاً، ص ۴۷۰

روحی طیبی

نظیر اکبر آبادی کا فن

کسی خاص شخص کی مخصوص خدمات کا ذکر کرنا ہوتو سب سے پہلے خود اس شخص کی سوانح، زمانے، ماحول اور اس کے فن کے بعض گوشوں کی بے نقابی کا مسئلہ سامنے آ جاتا ہے اس اصول کے پیش نظر ہمیں بھی سب سے پہلے نظیر کے فن شعر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس کے عہد اور اس کے کلام کو تنقید و تبصرے کی کسوٹی پر پرکھنا ہوگا۔ شاعری کی بہت سی قدریں مرتب کی جاسکتی ہیں لیکن وہی شعر صحیح معنٰی میں شعر کہے جانے کا مستحق ہے جس میں ہمہ گیریت کے بہت سارے خواص مشترک ہوں ہمہ گیری سے مراد یہ کہ شعر کی بنیاد ایسے خیال پر ہونی چاہیے جو زمانے ملک و قوم اور رنگ و نسل کے اختلافات سے گزر کر تمام نوع انسانی پر یکساں موثر ہو اور جو فطرت کا آئینہ نظر آئے۔ نظیر اکبر آبادی کو اردو شاعروں کی صف میں ہم رہبری اور رہنمائی کے بلند مقام پر دیکھتے ہیں لیکن بعض تنقید نگاروں نے نظیر کے کلام کو نشانہ بنایا ہے۔ مولانا حالی اپنے دیوان کے مقدمے میں لکھتے ہیں ''آج کل شاعر کے کمال کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے کس قدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی سے استعمال کیے ہیں اگر ہم اس کو معیار کمال قرار دیں تو بھی انھیں کو اردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا اگرچہ نظیر اکبر آبادی نے شاید میر سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں مگر اس کی زبان کو اہلِ زبان مانتے ہیں بخلاف میر کے ہر لفظ ہر محاورے کے آگے سب کو سر جھکانا پڑتا ہے۔'' نظیر اکبر آبادی کے بارے میں مختلف اور متضاد آرا ملتی ہیں قدیم نقادوں نے ان کو شاعر ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا جب کہ جدید نقادوں نے ان کو بلند مقام دیا بہر حال اب تقریباً تمام نقاد نظیر کی عوامی شاعری کے معترف معلوم ہوتے ہیں اور یہی نظیر کی عظمت کی دلیل ہے۔ نظیر اردو زبان کا بنجارہ شاعر ہے اور اس کی شاعری ایک ایسے خودرو پودے کی سی ہے جو چمن بندی کی تکلفات سے آزاد رہ کر کھلی فضا میں پھلتا پھولتا ہے اور اسے جو آب و ہوا میسر آئی ہے اس کو قبول کر لیتا ہے نظیر کی شاعری اپنے ماحول کی پیداوار ہے اور اس میں مقامی تہذیب و معاشرت کے تمام اچھے اور برے پہلو نظر آتے ہیں عوامی زندگی کی جیسی عکاسی اور ترجمانی نظیر کے یہاں ملتی ہے کسی اور شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ جمہوریت کی طرح نظیر کی شاعری بھی عوام کی ہے۔ عوام کے لیے ہے اور عوام ہی کی زبان میں ہے۔ زندگانی بے نظیر کے مصنف پروفیسر شہباز نے اسے میر تقی میر سے بھی اونچا شاعر بتایا ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے نظیر کی عامیانہ نشاندہی کی ہے۔ مگر غلام یزدانی صاحب کا خیال ہے کہ آئینِ اکبری کے بعد

☆ لیکچرار۔ ڈی ایچ اے گرلز کالج، ڈیفنس، کراچی

ہندوستان کے ادب میں کوئی ایسی کتاب نہیں جس میں سے اقتصادی، عمرانی اور مذہبی حالات کا ایسا صحیح موقع ہم کو مل جائے جیسا کہ کلیات نظیر میں موجود ہے۔ نظیر نے غزل کے دور میں نظم کی اہمیت کو محسوس کیا نظیر زندگی کا گہرا شعور رکھتے تھے اور زندگی کے حقائق سے پوری طرح آگاہ تھے ان کی شاعری میں خوب سے خوب تر کی تلاش کے اشارے دکھائی دیتے ہیں مگر افسوس انھوں نے ایک ایسا زمانہ پایا جب کہ ان کی عوامی شاعری کی جگہ لوگ غزل کی بھول بھلیوں میں گم تھے نظیر نے جس بے باکی اور دلیری سے اس دور کی زندگی کے مسائل کو بے نقاب کیا شاید اور لوگوں میں زندگی سے آنکھیں ملانے کی ہمت ختم ہو چکی تھی ایک زمانے تک ان کی شاعری کو بہت کمتر سمجھا جاتا رہا مگر بیسویں صدی کی عوامی تحریکوں نے نظیر کو پھر سے زندہ کر دیا اور ان کا مقام اور رتبہ ادب کے اوراق میں متعین کر دیا۔

نظیر کی فنی خوبیوں کو سمجھنے سے پہلے ہم ان کے مختصر حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شاعری کے پس منظر کو بہتر انداز سے سمجھنے کے لیے اس عہد کے تاریخی، معاشی اور سماجی محرکات کا مختصر جائزہ لیں گے کلیات نظیر کے مقدمے کے مطابق نظیر ۱۷۳۵ء میں بمقام آگرہ میں پیدا ہوئے نظیر کا نام ولی محمد اور باپ کا نام محمد فاروق تھا شرفائے اکبرآباد میں سے تھے زندگانی بے نظیر کے مصنف لکھتے ہیں محمد فاروق کی بارہ اولادیں پہلے فوت ہو چکی تھیں یہ تیرہویں تھے اور ان کو نظر بد سے بچانے کے لیے ان کے ناک کان چھدوا کر ان کو لڑکی سا بنا دیا تھا نظیر نے ہوش سنبھالا تو مولوی محمد کاظم اور ملا ولی محمد شارح مثنوی مولانا روم فضل و کمال کی مجلس قائم کیے بیٹھے تھے دوسرے طالبان علم کی طرح نظیر کئی درس گاہوں سے فیض یاب ہوئے بعض روایات سے پتہ چلا کہ نظیر آگرے میں نہیں دہلی میں پیدا ہوئے اور اس کی تصدیق تاریخ ادب اردو کے مصنف رام بابو سکسینہ نے بھی کی ہے دہلی میں جب نظیر کی ولادت ہوئی تو یہ وہ زمانہ تھا جب مغل سلطنت کا زوال تھا اور محمد شاہ ثانی کو سید حسین علی اور سید عبداللہ نے جو تاریخ میں بادشاہ گر کے نام سے مشہور ہیں۔ شہنشاہ ہند کی حیثیت سے تخت پر بٹھا دیا تھا دہلی پر نادر شاہ کا حملہ ہو بعد میں احمد شا ابدالی نے چڑھائی کی تو نظیر اپنی ماں اور نانی کے ساتھ دہلی چھوڑ کر آگرے گئے زندگی بھر درس و تدریس میں مشغول رہ کر اپنی روزی مہیا کی۔ نظیر میر و سودا اور دیگر قدیم شعرائے دہلی کے معاصر کہے جا سکتے ہیں اور عمر چوں کہ زیادہ پائی تھی اس وجہ سے انشا جرأت اور ناسخ تک کا زمانہ دیکھا نظیر فارسی اور عربی زبان کے علاوہ فن خوش نویسی سے بھی واقف تھے جس کا اس زمانے میں بہت چرچا تھا۔ پتنگ بازی، کبڈی، شطرنج، کبوتر بازی کا عام رواج تھا نظیر ان سب میں طاق تھے۔ نظیر نے عمر کا بڑا حصہ معلّمی میں گزارا شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔ رام بابو سکسینہ تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں، ''نظیر بہت محبت پسند آدمی تھے اور مختلف قسم کے لوگوں کی محبت میں ملتے جلتے تھے اسی وجہ سے ان کا تجربہ بہت وسیع تھا جس سے انھوں نے اپنے اشعار میں بہت فائدہ اٹھایا ان کو گانے سے، کثرت سے اور سیر تماشے سے بہت شوق تھا۔ نہایت حلیم الطبع منکسر المزاج اور باذوق واقع ہوئے تھے کسی طرح کا تعصب نہ تھا ہندو مسلمان سب ان کو مانتے تھے اور ان سے محبت کرتے تھے۔

سترہویں صدی تک جاگیردارانہ نظام اپنی حدوں کے اندر ترقی کرتا رہا لیکن اٹھارویں صدی کے وسط میں یورپی طاقتوں کی دخل اندازی اور استحصال کی وجہ سے ملک کے بعض علاقوں میں صورتِ حال بدل رہی تھی جو اس صدی کے ختم ہونے ہوئے شمالی ہند پر بھی اثر انداز ہوئی۔ بادشاہوں کی تبدیلیاں فوجی معرکہ آرائیاں انقلابی تبدیلیاں لا رہی تھیں ہندوستان کی دولت انگلستان پہنچ کر وہاں کے صنعتی

انقلاب کا سبب بن رہی تھی اور ہندوستان اپنے خیال میں صرف اپنی تقدیر کا تماشا دیکھ رہا تھا۔

نظیر نے اس دور میں آگرہ میں پیشہ ور معلم کی زندگی بسر کی۔ محل سے اپنے ٹٹو پر بیٹھ کر آتے تھے مزاج کے آزاد تھے میلوں ٹھیلوں تقریبوں اور تہواروں میں کھل کر حصہ لیتے یہ عوامی میلے تھے اسی لیے ان کو عوام کی زندگی اور ان کے مشاغل کو قریب سے دیکھنے اور ان میں شرکت کا موقع ملا آگرہ اپنی روایتوں کے لحاظ سے کرشن کنہیا اکبر شاہجہاں اور سُورماؤں کا آگرہ ہے معاشی حیثیت سے وہ زوال پذیر شہر ہے جس میں افلاس اور بدحالی زوروں پر ہے جو ایک طرف مغل حکومت کا حصہ ہے اور دوسری طرف برطانوی استحصال کا شکار بن رہا ہے خارجی حالات کی وجہ سے جو داخلیت پیدا ہو رہی تھی اس کی پرچھائیاں شعر و ادب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اردو کا کوئی شاعر نظیر سے زیادہ سادہ طریقے پر عوام کے قریب نہیں ہے۔ مگر اس عوامی تعلق نے نظیر کے مطالعہ کو مشکل بنا دیا ہے قدیم کلاسیکی نقاد انھیں کوئی درجہ نہیں دیتے اور جدید نقاد ان کو واقعیت پسندی کا علمبردار قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نظیر کے عوام کو دائرہ بہت وسیع ہے نظیر کی انسان دوست شاعری نے انھیں صف اوّل کے شعرا میں جگہ دی۔ نظیر کے ہاتھوں گویا اردو شاعری کے محل میں ایک چور دروازہ بن گیا جس کے راستے مقررہ موضوعات کے علاوہ دوسرے موضوعات داخل ہو گئے نظیر سے قبل بھی دکن میں قلی قطب نے اور دلّی میں فائز نے بعض عام دلچسپیوں کے موضوعات پر نظمیں لکھیں تھیں لیکن انداز رومانی اور مقصد شاعری تھا۔ نظیر نے پہلی دفعہ عوام کو موضوع شعر کا مستحق سمجھا اور ان کی زندگی کو ان کی سادگی کو نقائص کے ساتھ پیش کر کے ان کی انسانیت کو نمایاں کیا جو جاگیرداری کے زوال پذیر دور میں بھی اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں تفریحوں اور غموں کے ساتھ اپنی اپنی قسمت پر شاکر ہیں جو زندہ اور متحرک ہیں۔ یہی ہے وہ پس منظر جو اس عہد کے شاعر کو آٹے، دال، روٹی، بے روزگاری، مفلسی اور بھوک کے لیے کی جانے والی جدوجہد کا ذکر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے:

دیکھ لے اس چمنِ دہر کو دل بھر کے نظیر
پھر تیرا کاہے کو باغ میں آنا ہوگا

نظیر اکبر آبادی ایک پوری تہذیب کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری ایک مکمل تہذیب کی شاعری ہے۔ نظیر اکبر آبادی ایک ایسے شاعر ہیں جو انسان کی ذات کے اندر سفر کرتے جا رہے ہیں۔ مقامی خوبصورتی کی نشاندہی کے باعث زمین اور آسمان تک پھیلی ہوئی پوری کائنات کی شاعری کرنے لگتے ہیں نظیر زندگی کے ہنگاموں سے شاعری کا سفر شروع کرتے ہیں پھر موسموں اور تہواروں سے گزرتے ہوئے زندگی کی ساری رنگینیوں کو اپنی شاعری میں سمیٹ لیتے ہیں:

بس کیا خوشی کیا ناخوشی یکساں ہے سب اے دوستو
گر یوں ہوا تو کیا ہوا گر ووں ہو تو کیا ہوا

وہ نفرتوں کدورتوں تعصبات اور کینہ پروری سے بے نیاز اور بے تعصب انسان تھے ان کے دماغ کے دریچے ہر طرف کھلے ہیں ان کے دل میں کسی کے لیے عناد نہیں کوئی میل نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ محرم کے مہینے میں گریہ بھی کرتے ہیں جنم آشٹمی پر بھجن بھی گاتے

ہیں۔ اخلاقی بخشوں سے بالاتر ہیں وہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری پڑھ کر ہمیں اپنی تہذیب و ثقافت کا سراغ ملتا ہے۔ نظیر کی شاعری بامعنی شاعری ہے۔ بہاریں پھول خوشبو ہوائیں ان کی شاعری کا حصہ ہیں جن کے ساتھ سارے رسم و رواج تہذیبی بندھن اور آزادیاں شامل ہیں نظیر کی دس گیارہ ایسی دلچسپ اور موثر نظمیں ہیں جن کے اکثر اشعار فقرا اور سادھو خوش الحانی سے پڑھ کر ہمارے دلوں کو بیتاب کرتے ہیں۔ ان کی تمثیلیں بہت اعلیٰ اور دلکش ہوتی ہیں ان کی نظم بنجارہ نامہ ''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ'' مغرور اور سرکش لوگوں کے لیے ایک تازیانہ عبرت ہے اور آگاہ کرتا ہے کہ دنیا دارِ فانی ہے اس کو چھوڑو اور عاقبت کی فکر کرو نظیر کا مقابلہ اس معنی میں شیخ سعدی سے خوب ہو سکتا ہے کیوں کہ دونوں کا کلام صاف اور سلیس ہے دونوں میں تصوف کا رنگ ہے دونوں عاشقانہ رنگ کے استاد اور اپنے اپنے انداز میں نصیحت گو بھی ہیں نظیر کا مقابلہ کسی بھی دوسری زبان کے بہتر سے بہتر اخلاقی شاعر سے ہو سکتا ہے۔ وہ ''با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام'' کے پورے عامل تھے ہندو مسلمان دونوں ان کو اپنا پیر و مرشد اور گرو سمجھتے تھے نظیر گرو نانک کے ایسے تارک الدنیا فقروں اور سادھوؤں کے خاص شاعر تھے جو ترک ماسوا اللہ کا سبق دیتے ہیں انگریزی شعرا میں یہی حال ورڈسورتھ کا ہے جس کی سانٹ بہت مشہور ہے۔

نظیر کی وسیع النظری ان کے کلام کو دوسری شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کی نظمیں ذر کی جو محبت تجھے تڑپائے گی بابا، بٹ مارا جل کا آ پہنچا ٹک اس کو دیکھ کر ڈرو بابا ایسی ہیں جس میں ہمہ گیری ہے اس کے علاوہ موت، فنا، بے ثباتیِ عالم اور ناپائیداری کا الم انگیز احساس دوسری تمام نظموں پر غالب آ جاتا ہے۔

نظیر ایک خالص ہندوستانی شاعر ہیں ان کی ہمدردی صرف بنی نوع انسان تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ حیوانات اور بے جان اشیا سے بھی اُنس و محبت رکھتے ہیں۔ خاص کر ان کی نظمیں ریچھ کا بچہ، گلہری کا بچہ، ہرن کا بچہ، بلبلیوں کی لڑائی، کبوتر بازی، ہولی، دیوالی آگرے کی پیراکی سب ایسی نظمیں ہیں جو زندگی سے اور زندہ دلی سے مملو ہیں۔ ہندو مسلم تہواروں اور تماشوں کا حال بھی لکھتے ہیں واقعی نظیر ایک خالص ہندوستانی شاعر ہیں کیوں کہ ان کے خیالات ان کی زبان ان کے مضامین سب مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کی خدمت زبان کے ساتھ قابل قدر ہے۔ نظیر نے شعرا کے خلافِ شان الفاظ کو اپنے اشعار میں جگہ دی اور دنیا کو ان کی خوبیاں دکھلا دیں نظیر کی زبان دانی کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ عوام الناس کے خیالات اور جذبات اور ان کی بول چال کو خود ان ہی کی زبان میں بولتے ہیں۔ تصنع اور بناوٹ ان کے کلام میں بالکل نہیں ہوتی۔ نظیر کو جدید رنگ کا پیشرو کہا جا سکتا ہے۔ فطری شاعری کا آغاز جس کی ابتدا حالی سے ہوئی اس کے پیشرو نظیر اکبر آبادی ہی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی ایک ایسی طرز کی بنا ڈال گئے جو آگے چل کر ہماری زبان اور ادب کی ترقی بلکہ ہمارے قومی احساس کے از سر نو تعمیر کا باعث ہوا۔ نظیر ایک مصور شاعر ہیں وہ ایک بہت بڑے مرقع نگار ہیں شادی و مسرت کی محفلوں اور تہواروں کے بیان میں خوبصورت اور دلکش الفاظ استعمال کرتے ہیں اردو کا شیکسپیئر ہمارا کون شاعر ہو سکتا ہے؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے مرزا سودا بے مثل قصائد کے بادشاہ ہیں اسی وجہ سے ایک زبردست کامیڈی نگار تو ہو سکتے ہیں مگر ان میں فطرت انسانی کا دائرہ کار محدود ہے۔ میر تقی میر کے یہاں سوز و گداز بدرجہ اتم موجود ہے مگر کریکٹر نویسی کی کمی ہے۔ انشاء اللہ انشاء کے یہاں

ظرافت بہت ہے۔ میر انیس فطری شاعر ہیں اور زبان پر قدرت بھی باکمال ہے کیریکٹر نویسی کے بھی مشاق ہیں مگر دائرہ عمل مرثیہ گوئی ہے۔ نظیر بھی میر سودا انشاء اور انیس کی طرح زبان پر قدرت رکھتے ہیں ان کی دو نظمیں ڈرامائی خصوصیات رکھتی ہیں ایک لیلیٰ مجنوں جو ٹریجڈی ہے اور دوسری مہادیو کا بیا کا جو کامیڈی ہے۔ نظیر میں سودا کا زور، میر کی بلند پروازی، انشاء کی ظرافت اور انیس کا جوش وخروش نہیں ہے مگر ایک حد تک ان سب کی صفات موجود ہیں نظیر نے معاشرتی زندگی کے اس نشاط انگیز پہلو کی ترجمانی کی ہے ان مناظر کی عکاسی کی جو عوام کی مختلف حالتوں کو بیان کرتے ہیں نظیر ہندوستانی معاشرے کے ایسے رکن تھے جنھوں نے تمام اجتماع انسانی میں گھل مل کر اپنی انفرادیت کو قائم رکھا نظیر کی شاعری اور ان کی زندگی کا کینوس خاصا وسیع ہے۔ ان کے کلام کی ہمہ گیری میں زندگی کے بہت سے پہلو سمٹ آئے ہیں زندگی کی ہر سطح پر ان کا مطالعہ ذاتی اور حقیقت پر مبنی ہوتا ہے نظیر میں انسان دوستی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے اور وہ انسان میں کسی طبقے یا در کے قائل نہ رہے ان کی نظم آدمی نامہ ایک ایسی مشہور نظم ہے جس میں انھوں نے ہر طرح کے انسانوں کا کردار پیش کیا ہے اور یہ دلیل دی ہے کہ آخر کو سب انسان ہیں:

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

منظر کشی کے بھی اعلیٰ درجے کے نمونے ملتے ہیں کوئی فطری موسم ہو یا عوامی میلہ عوام کی ترجمانی عوامی عکاسی عوام کی زبان میں:

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
روز بلدیو جی کا میلہ ہے

ایک طرف منظر نگاری تو دوسری طرف سادہ زبان و بیان میں اعلیٰ ترین اخلاقی سبق کا بیان جس کا منہ بولتا ثبوت ان کی نظم بنجارہ نامہ ہے جس میں انسان کو اس دنیا کا مسافر اور اس کے قیام کو ایک وقفہ بتایا ہے:

گر تو ہے لکھی بنجارہ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا ایک اور بیوپاری ہے
سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

نظیر کا دور درباری شاعری کا دور تھا اور شعر گوئی کا اصل مقصد تخیل کی پروازی، انداز بیاں کی رعنائی اور رنگینی تھا۔ تنقید کے دورِ جدید میں جب شاعری کی اصلیت اور ماہیت کے تصورات میں انقلاب آیا تو عوامی شاعری انسان دوستی اور لوگوں کی روزمرہ زندگی کی خوشیاں اور محرومیاں، امیدیں اور ناکامیاں موضوع شعر قرار پائیں تب نظیر کے کلام کا اعتراف کیا گیا نظیر کے یہاں الفاظ کا جتنا ذخیرہ موجود ہے وہ شاید اردو شاعری میں میر انیس کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں ملے گا۔ نظیر کی شاعری میں حقیقت بھی ہے رنگا رنگی بھی لطافت بھی ہے اور ظرافت بھی ان کی نظموں نے انھیں شہرت دوام بخشی ہے جنھوں نے عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑے منفرد انداز میں پیش کیا ان کی شاعری ان کے اپنے دور کی عکاسی ہے اس میں ان کے عہد کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے بالخصوص

قدرتی مناظر کو انھوں نے اس انداز سے پیش کیا لگتا ہے کہ یہ منظر آنکھوں کے سامنے ہے واقعات نگاری اور عوامی میلے ٹھیلے کی روداد ہو یا آنکھوں دیکھا حال نظیر کی شاعری کا کمال ہے۔ انھوں نے عید پر بھی نظم کہی ہولی پر بھی، بسنت کو موضوع بنایا تو دیوالی کو بھی وہ کون سی عوامی چیز ہے جسے انھوں نے شعری قالب نہ دیا ہو اور یہ وصف ان کی عوامی شاعری کا منہ بولتا ثبوت ہے جس کی ایک مثال ان کی نظم روٹی ہے:

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے — یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے، — ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

نظیر اکبر آبادی کی مقامیت میں بڑی پائیداری ہے ایک طرف تو وہ آدمی نامہ لکھ کر پوری دکھی انسانت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ عام آدمی کی مشکلات اور روٹی کی خاطر کی گئی مشقتوں سے پوری طرح واقف ہیں اور عام آدمی کی اخلاقی قدروں سے بھی کماحقہ آشنا ہیں ان کی اخلاقی قدروں کا اندازہ ان کی کئی نظموں سے ہوتا ہے جس کی ایک مثال روٹی نامہ ہے۔

نظیر اکبر آبادی واحد شاعر ہیں جنھوں نے ہمیں ہماری معاشرتی زندگی کی جھلکیاں دکھائیں ہیں وہ اپنے اس اظہار کے لیے جزئیات نگاری میں کرداروں کی نفسیاتی کیفیات اور ان کی ادراکی سطحوں کو اپنے ایک ایک شعر اور ایک ایک بند میں سموتے چلے گئے ہیں اور ذخیرہ الفاظ کا اضافہ بھی کرتے گئے ہیں زندگی کے دکھ مصائب آسودگی عیش و عشرت ہر طرح کی زندگی کے ردعمل کو ظاہر کرتے ہیں:

کیا کیا کریں ہیں ناز و ادا پیٹ کے لیے
بلی بھی مارتی ہے چوہا پیٹ کے لیے

نظیر اکبر آبادی اپنے دور کی تہذیبی معاشرتی، معاشی ثقافتی اور طبقاتی صورت حال کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

عوامی رنگ:

نظیر ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنی زندگی اور شاعری کے اعتبار سے طبقہ عوام میں سے ہیں انھوں نے اپنی شاعری کے لیے موضوعات بھی عوام ہی میں سے لیے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری میں عوامی زندگی کی، دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں وہ اپنی نظموں میں چھوٹے چھوٹے موضوعات جیسے تربوز، ککڑی، روٹی، تل کے لڈو، مٹی کے کورے برتن وہ عوام کی بدحالیوں پر بھی غریبوں کی محتاجی پر بھی ان مجبوریوں اور محرومیوں پر بھی طبع آزمائی کرتے ہیں جس کے ساتھ ان کا لہجہ عوامی ہو جاتا ہے۔

سماجی حالات کی ترجمانی:

نظیر نے بہت قریب سے اپنے عہد کے سماجی حالات کو بھی دیکھا ہے صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ محسوس بھی کیا ہے یہ وہ دور تھا جب برصغیر میں غیر ملکی حملہ آوروں نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے لوگوں میں بدامنی بے اطمینانی اور عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو چکا تھا

عوام ایک مجبور طبقہ تھا براعظم کے مرکزی شہروں کی تباہی و بربادی شاعر کے سامنے تھی اسی صورت حال کے پیش نظر نظیر نے ایک طویل نظم ''شہر آسوب'' لکھی تھی دیگر نظموں میں پیسے کا فن، چپاتی، آٹے دال کا بھاؤ مفلسی بھی اہم نظمیں ہیں نظیر کی کلیات کے مطالعے سے ان کے عہد کے تقریباً ۹۰/۸۰ سال کی پوری تاریخ سیاسی و سماجی پس منظر کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ نظیر بیرون بینی کے ماہر تھے نہایت، تیز قوت مشاہدہ سے متصف تھے۔ وہ لوگوں کے اندر رہنا پسند کرتے تھے۔ ان کے یہاں انسانی ہمدردی ہے وہ انسانوں کے مظلوم گروہ سے زیادہ قریب ہیں آدمی شرافت اور کمینے سے لے کر شاہ تا وزیر ہیں:

آدمی ہی صاحبِ عزت بھی اور حقیر
ہاں آدمی مرید ہیں اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہلاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر کی شاعری میں دردمندی سوز و گداز حکمت اخلاق کے ساتھ لہجہ نہایت ملائم اور نرم ہے مثلاً وہ کہتے ہیں جو خاک سے بنا ہے آخر کو خاک ہے۔ نظیر دنیا کی ہوس کو عارضی گردانتے ہیں ہوس زر کو بھی ہدف بناتے ہیں اور سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا اس کا ثبوت ہے۔ اس لہجے میں ان کی نظمیں کل نفس ذائقہ الموت اور پھر انجام وغیرہ ایسے ہی جذبوں کی غمازی کرتی ہیں۔ منظر نگاری میں مشاہدے کے باعث خوبصورتی سے سماں باندھتے ہیں کوئی میلا ہو تقریب ہو دیوالی ہولی عید موسم بہار برسات ان تمام نظموں میں اپنی بصیرت کی جوت جگائے ہوئے مرقع نگاری کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں مرقع نگاری اور منظر کشی کی مثال ہیں خاص کر نظم برسات کی بہاریں گر کر کسی کپڑے دلدل میں ہیں معطر:

پھسلا کوئی کسی کا کیچڑ میں منہ گیا بھر
ایک دو نہیں پھسلتے کچھ اس میں آن اکثر
ہوتے ہیں سیکڑوں کے سر نیچے، پاؤں اوپر
کیا کیا مچی ہیں یاروں برسات کی بہاریں

آدمی سے آدمی کے تضاد اور تعصبات اور دوسری جذبات کو ابھارتے چلے جاتے ہیں نظیر کی شاعری کا یہ وصف ان کی شاعری کو مقبول بنانے میں زیادہ معاون رہا ہے۔ یوں تو ہر شاعر کی تخلیقات میں صوتی رنگ و آہنگ اور الفاظ کا حسن موجود ہوتا ہے۔ لیکن نظیر کی شاعری میں یہ حسن و توازن سب سے منفرد اور ممتاز دکھائی دیتا ہے۔ نظیر الفاظ اور ان کے آہنگ کو بڑے سلیقے کے ساتھ یکجا کرتے ہیں وہ قوافی اور ردیف باندھنے میں مشکل سے مشکل مقام پر آسانی سے گزر جاتے ہیں عربی، ہندی، فارسی اور مقامی زبان کے الفاظ کا بلا تکان استعمال کرتے جاتے ہیں بعض خوابیدہ الفاظ کو زندہ کرتے ہیں کئی نئے الفاظ کو ایجاد کر لیتے ہیں۔

نظیر بنیادی طور پر نظم کے فطری رنگ کے شاعر ہیں انھوں نے غزل بھی کہی مگر رنگ نظم ہی کا ہے مثنویات بھی لکھیں نظموں میں

مخمس سے رنگ پیدا کیے اور یہ سب یادگاران کی کلیات نظیر میں موجود ہیں نظیر اپنے وقت کی پوری صدی کا سب سے بڑا عوامی اور فطرت شناس شاعر ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ قدروں کے بدلنے کے ساتھ ہی نظیر کی قدر بھی بڑھی ہے اور اس کی شاعری کے کچھ پہلوؤں کو بہت زیادہ روشن کر کے دکھایا گیا حالاں کہ نظیر ایک ایسا عجیب وغریب شاعر ہے جو پورے کا پورا کسی بھی ایک نظریے پر پورا نہیں اترتا لیکن جزوی طور پر ہر رنگ میں نظر آتا ہے وہ آزاد خیال وسیع المشرب انسان تھا جو اپنی دھن میں گاتا ہوا بازار عالم سے گزر گیا جس چیز پر نظر پڑی جو چیز اچھی لگی اس پر شعر کہہ دیا نظریے یا ضابطے کا پابند نہیں ہے وہ سماجی اور اخلاقی قدروں کا مربوط نظام نہیں رکھتا وہ خلوت وجلوت کے معاملات کا برملا اظہار کر دیتا ہے اور ذہنی کشمکش میں پڑے بغیر دونوں کے محرکات اور مطالبات بیان کر دیتا ہے جوگی کے لباس میں صوفی ہے وہ فنا بقا کا فلسفہ بھی بیان کرتا ہے اور آٹے دال کا بھاؤ بھی زندگی کو تمام طہارتوں اور آلائشوں سمیت قبول کرتا ہے اور زندگی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے اخلاق یا مروت سے کام نہیں لیتا نظیر زندگی کے بارے میں یونانی فلسفیوں کے اس طبقے کا ہم خیال معلوم ہوتا ہے جن کا نصب العین ہے کھاؤ پیو مزے اڑاؤ کیوں کہ کل تم فنا ہو جاؤ گے زندگی کی یہ لذت اندوزی ہم کو نظیر کے یہاں ملتی ہے اس معاملے میں وہ حافظ اور خیام کے ہمنوا بھی ہیں اور سعدی کے بھی نظیر کے اس کثیر المقاصد نظریہ حیات اور وسیع القلبی کا اندازہ ان کی نظموں کے عنوانات سے لگایا جاسکتا ہے انھوں نے حمد نعت منقبت اور مدح سلیم چشتی کے ساتھ مدح گرو نانک، درگا جی کا درشن، کنہیا جی کا جنم بھی لکھا عید، ہولی، دیوالی، بسنت پر طویل نظمیں فنا و بقا خوشامد، مفلسی اور روٹی کا فلسفہ بھی بیان کیا یہ نظمیں حقیقتوں کا اظہار ہیں بنجارہ نامہ زندگی کی تلخ حقیقت کی عکاسی ہے نظیر اعتدال اور توازن کے بکھیڑے میں نہیں پڑے بلکہ ان کا فلسفہ زندگی یہ ہے۔

ساقی و مطرب شرابِ ارغوانی پھر کہاں
عیش کر خوباں میں اے دل، شادمانی پھر کہاں

زندگی سے لطف اندوز ہونے کے باوجود زندگی کے انجام پر ان کی گہری نظر ہے ان کی سب سے دلکش نظم بنجارہ نامہ ہے جو اپنے متحرک آہنگ تمثیلی انداز اور جذبات نگاری کی بنا پر اردو کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس میں نظیر کا عارفانہ حسن نظر اور شاعرانہ حسن بیان عروج پر ہے اور معنی و بیان میں اتنی خوشگوار ہم آہنگی ہے کہ زندگی کا قافلہ پورے ہنگامے کے ساتھ چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو آخر کار تھک ہار کر فنا ہو جاتا ہے اور زندگی کا عبرتناک انجام آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے بنجارے کی تمثیل بھی نظیر کے مزاج اور تجربہ کے مطابق ہے۔ نظیر نہ درباری آدمی تھے نہ خانقاہی لیکن وہ روحانی قدروں کا احترام کرتے ہیں اور مادی اقدار کو بھی عزیز رکھتے ہیں اور بلا کے حقیقت پسند ہیں پیسہ نامہ، کوڑی نامہ میں وہ بڑی تلخ حقیقتوں کا انکشاف کرتے ہیں۔

پیسا ہی رنگ و روپ پیسا ہی مال ہے۔

نظیر کے مزاج میں شوخی اور ظرافت بھی بہت تھی لیکن وہ کھوکھلی ہنسی نہیں ہنستے بلکہ صوفیوں اور فلسفیوں کی طرح زندگی کا تماشا دیکھ کر اس کی نیرنگیوں، بے اعتدالیوں اور فطرت انسانی کی دلچسپ لغزشوں پر مسکرا دیتے ہیں۔ وہ انسانی کمزوریوں کا نہ تو مذاق اُڑاتے ہیں

اور نہ خود کو اس سے بلند سمجھتے ہیں وہ ہر رنگ میں خوش اور مست رہنے کے قائل ہیں:

ہر آن ہنسی، ہر آن خوشی، ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دلگیری ہے بابا

نظیر کی اکثر نظموں میں ایک شعر یا ایک مصرع نہایت اہم ہوتا ہے اور یہی مصرعہ اس نظم کا بنیادی خیال ہوتا ہے ان کی طویل نظمیں بھی اسی بنیادی خیال کے گرد پھیلتی چلی جاتی ہیں وہ اسی بنیادی بات کو ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں مثلاً باقی وہی اللہ کا ایک نام رہے گا اس مصرع کو سن کر بار بار زندگی کی کم مائیگی اور دنیا کی بے ثباتی کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے وہ ابھی بنیادی مصرعوں پر تخیل اور مشاہدے کی مدد سے اونچی عمارت بناتے ہیں اور پھر اپنی نظموں میں سچی کھری بلکہ تلخ حقیقتیں پیش کرتے ہیں۔

حقیقت پسندی کی مثال دیکھیں:

سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آ کر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی

نظیر اپنے خیالات و مشاہدات کو سمیٹتے نہیں بلکہ پھیلا کر بیان کرتے ہیں مثلاً گلیوں بازاروں سے گزر کر وادیوں میں جا پہنچتے ہیں اور منٹو کی طرح حقیقت نگاری پر اتر آتے ہیں نظیر کا دور اخلاقی انحطاط کا دور تھا جس کی ان کی شاعری پر گہری چھاپ ہے۔ نظیر نے شاعری اور زندگی میں اتنا قریبی رشتہ قائم کر دیا جو ایک بہت بڑی بات ہے۔ نظیر سے غالب اور اقبال کی سی فلسفیانہ بصیرت کی توقع نہیں کی جا سکتی تاہم نظیر نے زندگی کو شاعری اور شاعری کو زندگی بنا دیا نظیر نے جاگیردارانہ دور میں جمہوری زندگی کی تصویر پیش کی اور اپنے فکر و نظر سے نئی دنیا آباد کی۔

ڈاکٹر غلام حسین فنی اعتبار سے نظیر کی منظومات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں ''فنی لحاظ سے نظیر نے اپنی نظموں میں مخمس ترجیع بند مسدس کو ترجیح دی ہے'' زندگی کے مختلف واقعات کو الفاظ کی شکل میں تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے ان کی نظموں کا ہر بند اپنے دامن میں زندگی کا ایک بھرپور منظر اور بھرپور واقعہ لیے ہوئے ہے نظیر کے موضوعات میں مکافات کا تصور فنا و بقا، دنیا کی بے ثباتی کا احساس، صبر و شکر کی تلقین انسان اور معاشرے کی اہمیت، انسانی محبت کا عالمگیر تصور اور مذہبی رواداری، نظیر کا ایک ایسا عوامی شاعر ہے جس کے صحیح مرتبے کا تعین نہ ہو سکا نظیر کی شاعری ہے جس کی شاعری اہل فرنگ کے نصاب کے مطابق سچی ہے گر ہندوستان کی لفظ پرستی اس کو سرے سے شاعر تسلیم نہیں کرتی۔ ''نظیر کے عوامی شاعر ہونے کی تائید خود ان کی نظم آدمی نامہ ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ مساوات کے علمبردار تھے۔ پروفیسر احتشام حسین کہتے ہیں نظیر کا کلام پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود عوام میں سے تھے نظیر اپنی

دنیا کے تنہا انسان تھے جنھوں نے رابن سن کروسو کی طرح سب کچھ خود کیا نظیر کی شاعری میں وسعت کے ساتھ مرکزیت ہے خاص موضوع ہے اور اس موضوع سے عوام کا تعلق ہے۔ احتشام حسین لکھتے ہیں کہ نظیر نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی تو عوام نے ہی نظیر کو زندہ رکھا۔ بنجارہ نامہ اور آدمی نامہ اس کا ثبوت ہیں۔

آدمی نامہ کا مختصر تجزیہ: پروفیسر احتشام حسین کہتے ہیں:

''آدمی نامہ میں انھوں نے مفلس عوام کے زخم پر مرہم لگانے کی کوشش کی ہے' تقدیر پرستی عوام کا مقدر تھی جبھی نظیر بار بار کہتے ہیں ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی۔ نظیر کا آدمی نامہ اردو شاعری کا ایک ایسا منشور یا پیغام ہے جو نوع انسانی کی تعمیر و ترقی کے لیے سنگ میل ہے۔''

نظیر کی جزئیاتی نگاری اور زبان دانی کے متعلق جنوری ۱۹۴۰ء کے نگار میں مولانا عبدالباری آسی کا مضمون شائع ہو چکا ہے ملکی چیزوں کی جس قدر نظیر کے کلام میں افراط ہے جس خیر و خوبی سے اس کا تذکرہ اس کے یہاں ہے وہ اس وقت تو کیا اس وقت بھی کسی ہندوستانی شاعر کے ہاں موجود نہیں یہ وہ باتیں ہیں جو نظیر کے چند خیر خواہوں نے اس کو ہندوستان کا شکسپیئر بتایا ہے اور ملکی شاعر مانا گیا ہے یہی اس کا کمال شاعری ہے اور یہی اس کے کلام کی معراج۔ نظیر کی جزئیات نگاری کا عالم یہ ہے کہ ان کو مفصل بیان اور تشریح پسندی کا خوگر بنایا ہے جب بھی کوئی واقعہ پیش کرتے ہیں تو الفاظ کا ایک سمندر موجزن نظر آتا ہے اور ہم حیران رہ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر فین کی رائے یہ ہے کہ نظیر ہی ایسا شاعر ہے جس کے اشعار نے عام لوگوں کے دل میں راہ کی ہے۔ نظیر دنیا سے بے تعلق صوفی تھے وہ تقدیر کی نہ موافقت کی پروا کرتا تھا نہ مخالفت کی وہ اعلیٰ درجے کا جگت دوست تھا اس کی ذکاوت کی رنگارنگی ان کے رنگارنگ مضامین سے ظاہر ہوتی ہے جس پر اس نے طبع آزمائی کی ہے نظیر کی قوت تخیل اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے ایک ہی چیز کی مختلف نظموں میں مختلف پہلو سے مختلف تصویریں دکھائی ہیں اس کا دیوان تصویروں کا اعوان ہے جس میں ہندوستان والوں کے لیے کھیل تماشے بھی ہیں رنج و غم بھی ہے دل و دماغ کی واضح تصویریں بھی ہیں جو سب کی سب بولتی نظر آتی ہیں۔ نظیر فطری خوبی رکھتا ہے وہ خوش ہوتا ہے جب گروہ کا گروہ خوش ہے وہ عوام کے کھیل تماشوں سے مزہ لیتا ہے وہ ان کی مصیبتوں سے دکھ پاتا ہے صرف یہی ایک شاعر ہے جسے عوام کے لیے پیار و محبت سے لکھا صرف یہی شاعر ہے جس کو غریبوں مفلسوں سے ہمدردی ہے خدا کی مخلوق خاص کر آدمی کی فلاسفی بیان کرتا ہے:

اچھے بھی آدمی ہی کہلاتے ہیں اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر نے مادری زبان کے خزانوں پر اپنا سکہ بٹھا دیا ہے اس نے لفظوں کو نئی ترکیبوں اور نئے معنوں میں استعمال کرنے کی جرأت کی ہے جو کچھ نظیر نے لکھا اس میں مشکل سے ہی کوئی معمولی مصرعہ ہوگا جو کچھ اس نے لکھا وہ خود ایک مشاہدہ ہے نظیر کی موت کے

تقریباً ۷۵ برس کے بعد مولوی عبدالغفور صاحب پروفیسر اورنگ آباد کالج کا نام خاص طور پر قابل تذکرہ ہے جنھوں نے ۴۲۵ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب زندگانی بے نظیر کے نام سے مرتب کی۔ نظیر کا عہد ۱۷۳۰ء سے ۱۸۳۰ء جو عہدِ انقلاب بھی ہے گمنامی کا عہد بھی رہا ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ بھی نظیر کی شاعری کو ذہنوں سے محو کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ محمود اکبر آبادی کا تبصرہ روح نظیر انیسوی صدی کے آخری دور اور بیسوی صدی کے پہلے ربع کی عام ہندوستانی آنکھیں نظیر کے کمال کے جوہر کو پرکھنے سے قاصر تھیں آبِ حیات کے مصنف نے اگر نظیر کو نظر انداز کیا تو اس سے نظیر کی بے کمال یا جوہر ناشناسی ثابت نہیں ہوتی۔

نظیر کے عہد کی شاعرانہ فضا میں سودا، میر، جرأت، انشاء، مصحفی جیسے اکابر شعرا ہیں رنگ و اسلوب کے ہلکے ہلکے تنوع سے قطع نظر ان اساتذہ کے کلام میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے نظیر نے اپنی ایک الگ شاہراہ بنالی جو نئے راستے کھولتی چلی گئی جیسے (میر اور سودا کے ماحول میں نظیر)، (ذوق اور مومن کے ماحول میں غالب)، (آتش و ناسخ کے ماحول میں انیس)، (داغ اور امیر کے ماحول میں اکبر) نظیر اردو شاعری کی دنیا کا پہلا باغی ہے جس نے تحریک انقلاب کا سنگ بنیاد رکھا یہ غالب انیس اور اکبر کا متحدہ اثر ہے جس نے اقبال اور جوش جیسے صاحبانِ فکر و بصیرت شعرا اردو میں پیدا کیے جنھوں نے پرانی روش کو ترک کر کے فطرت انسانی کا غائر مطالعہ کیا دنیا میں چراغ سے چراغ جلا کرتا ہے دوسرا پہلے سے سیکھ کر تیسرے کو سکھاتا ہے خیالات کی نشوونما اور سوسائٹی کی درجہ بہ درجہ ترقی کا عام اصول یہی ہے لیکن بعض شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو کسی سے اپنا چراغ نہیں جلاتیں خود اپنی ذات کی فطری درخشانی کے باعث سب سے الگ تھلگ چمکتی ہیں نظیر نے اپنا چراغ کسی سے نہیں جلایا اس کی فطرت اور بصیرت اس کی رہنما بنیں وہ صحیح معنی میں تلمذ الرحمٰن تھا نہ اس کا کوئی استاد تھا نہ اس نے اپنا مخصوص انداز بیان اور نظریہ شعر کسی کو باقاعدہ سکھایا یہی وجہ ہے کہ جب سماج کا ناتراشیدہ فن نقاد اپنے محدود معیار کے مطابق اس کے کلام پر نقد کرنے بیٹھا تو اسے طرح طرح کی خامیاں نظر آنے لگی ضرورت تو اس بات کی تھی کہ نظیر کے نظریے کا جائزہ لیا جاتا اور خود اس کے وضع کردہ نقطۂ نظر کی حدود کے اندر اس کے کلام کے محاسن کو جانچا اور سمجھا جاتا۔ نیا فن پرکھنے کے لیے نیا معیار سامنے ہونے کی حاجت تھی اس لیے نظیر کا تقابل کسی اور سے ممکن نہ تھا۔

نظیر کے کلام پر تبصرے کے سلسلے میں نیاز فتح پوری صاحب ایڈیٹر رسالہ نگاہ کا نام مدتوں یاد رکھا جائے گا جنھوں نے جنوری ۱۹۴۰ء کا رسالہ خاص طور پر نظیر نمبر کے نام سے شائع کیا جس میں ایک درجن سے زائد مقالات تحقیقی اور بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی جمع کیا ہے۔ کہتے ہیں نظیر کا کوئی کلام ایسا نہیں ہے جو بچوں بوڑھوں میں مقبول نہ ہو وہ ہر عمر ہر طبقہ فکر میں اپنی جگہ بنا گیا ہے وہ بچوں کے ساتھ مل کر کھیلتا ہے جوانوں کی محفل میں حسن و عشق کی باتیں کرتا ہے اور بوڑھوں کی محفل میں وعظ و نصیحت بھی کرتا ہے۔ نظیر کی کلیات ایک ایسا نایاب ذخیرہ ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو معیشت و معاشرت کا کوئی انداز احساسات و تاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں جو اس کے کلام میں موجود نہ ہو عالم محسوسات کی شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس کا ذکر نظیر نے نہ کیا ہو۔ امیر و غریب کے لیے، بادشاہ کے لیے، بادشاہ گدا کے لیے، زاہد و رند کے لیے، غرض ہندو و مسلمان کے لیے علاحدہ علاحدہ سب کی دلچسپی کا سامان موجود ہے نظیر کا رنگ سخن ایسا نہیں جس میں واقعیت نہ پائی جاتی ہو۔ جو اس کی زبان سے نکلتا ہے وہ تخیل نہیں تجربہ اور مشاہدہ ہے وہ طبقہ عوام کا شاعر تھا نظیر نے کم و بیش ۱۰۰

سال کا زمانہ دیکھا نظیر کا عہد ان سب شاعروں کا عہد تھا نظیر بیک وقت متقدمین، متوسطین اور متاخرین کی صف میں جگہ پا سکتا ہے۔ اس کی چند مثالوں سے واضح ہو جائے گا۔ ٹھہرنا عشق کے آفات کے صدموں میں نظیر، کام مشکل تھا پر اللہ نے آسان کیا:

جس کام کو جہاں میں تو آیا تھا اے نظیر
خانہ خراب تجھ سے وہی کام رہ گیا

نظیر کی شعری خصوصیت کا مطالعہ دراصل اس کی جزئیات ہیں جو خاص کر منظر نگاری میں ہوتی ہیں۔ موسم کا ذکر ہو یا تہوار کا سماں پیش کرنا ہو یا محبوب کی دلبری کا ذکر غزل میں کرنا ہو تو کہتے ہیں:

وہ بولا کہ اس شوخ کتیں کہتے ہیں ہیرا
کام اس کا سدا دلبری و دل شکنی ہے
تب میں نے وہیں سن کے کہا اس سے نظیر آہ
ہیرا نہ کہو اس کو یہ ہیرے کی کنی ہے

نظیر کی ایک اور خصوصیت جو بہت کم کسی اور شاعر کے کلام میں نظر آئے گی یہ ہے کہ وہ موقع محل کے لحاظ سے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ سامعہ پر اس کا خاص اثر پڑتا ہے صوتی الفاظ کا استعمال بھی ہے:

روز مزوں سے رات کو برسے تھا مینھ جھمک جھمک
بوندیں پڑیں ٹپک ٹپک، پانی پڑا چھپک چھپک

نظیر کو اختراعِ الفاظ کا بڑا سلیقہ تھا موضوع کے لحاظ سے الفاظ کا اتنا صحیح استعمال کرتا تھا کہ الفاظ خود معنی ہو کر رہ جاتے تھے کئی الفاظ ایسے استعمال کیے ہیں جس میں معنویت پائی جاتی ہے۔ نظیر میں جدت و اختراع کا مادہ بھی بہت تھا۔

اس میں شک نہیں کہ نظیر اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان کا عجیب و غریب شاعر تھا جس میں کبیر کے اخلاق اور خسرو کی ذہانت کا نہایت دلکش امتزاج پایا جاتا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو شاعری میں غزل سے ہٹ کر سب سے پہلے اس نے نظمیں لکھنے کی ابتدا کی بلکہ سچ پوچھیے تو انتہا کر دی۔ علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں، ''اردو شاعری میں نظیر دورِ چہارم کے شاعر تھے یہ وہ دور تھا جب لکھنؤ میں جرأت و انشا و مصحفی کا طوطی بول چکا تھا اور میر تقی میر اور میر حسن اردو شاعری کی بساط بچھا چکے تھے۔

نظیر کے سامنے ان ہی کا انداز بیان تھا فارسی شعرا میں سعدی، حافظ، نظیری، خسرو اور بیدل کا کلام موجود تھا۔ اسی خوشگوار ماحول میں نظیر کی شاعری پروان چڑھی ہے۔ وہ جس سوسائٹی کے شاعر تھے اسی سوسائٹی کے رجحانات اسی کی زبان اسی کے پیرایہ بیان میں ادا کرنا پسند کرتے تھے۔ اگر نظیر کی شاعری لسانی نقطۂ نگاہ سے دیکھی جائے تو اس میں بعض خصوصیات اس زمانے کے لحاظ سے ممتاز پائی جاتی ہیں۔ مثلاً الفاظ کا ترنم، موسیقیت، ہر موضوع سے متعلق جزئیات ہیں۔ ان کی نظمیں عموماً تفصیلی ہیں جس میں زندگی کے ہر گوشے کو

بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے نظموں میں افسانویت بھی خاص طور پر پائی جاتی ہے مشرقی رسم و رواج کی ترجمانی زیادہ ہے حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری موجودہ سوسائٹی اور تہذیب کی آئینہ دار ہے۔

لسانیات کے حوالے سے بھی نظیر کی شاعری انھیں عوام کی صف میں جگہ دیتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ فطرت نگاری اور مخلوط معاشرے کی عکاسی اور اس کی ترجمانی میں نظیر کو اولیت حاصل رہی ہے۔ احتشام حسین رضوی کہتے ہیں، ''اردو ادب کی تاریخ میں نظیر کا اپنا ایک الگ دور ہے وہ کسی دور میں کسی گروہ کے ساتھ شریک نہیں کیے جاسکتے۔ نظیر نے دربار سے الگ رہ کر عوام سے رشتہ جوڑا نظیر کا اپنا ایک علاحدہ دور تھا جو تاریخی حیثیت سے اردو شاعری کے کئی ادوار پر حاوی تھا۔ ان کا دور ۱۸۳۵ سے ۱۸۳۰ء کا ہے جس میں کم از کم ۲۰ مشہور شعرا پائے جاتے ہیں۔

نظیر نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی تو عوام ہی نے نظیر کو زندہ رکھا اردو شاعری کی معیار پرستی کو نظیر نے فتح کر دیا تھا اگر عوام نے آدمی نامہ، بنجارہ نامہ کو یاد نہ رکھا ہوتا تو آج نظیر نہ ہوتا۔ نظیر انسانی متعلقات سے ان تمام معمولی چیزوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو کسی دوسرے شاعر کے لیے قابل توجہ نہ تھیں وہ مسلمانوں کے عرس اور ہندوؤں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے۔ عید اور شبِ برات کے ساتھ ہولی اور دیوالی سے بھی سچے ہندوستانی کی طرح لطف اٹھاتے تھے۔ نظیر کا فنی کمال ہے کہ وہ آدمی نامہ لکھ کر مفلس عوام کی ترجمانی کرتے ہیں جہاں ہر آدمی ایک ہی کشتی کا سوار نظر آتا ہے۔ طبقاتی اور سیاسی شعور بیدار کرنے کے لیے نظیر نے اسرار قدرت جیسی نظم لکھی کہتے ہیں:

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

نظیر نے اس دور کی زندگی سے شاعری کا دیا جلایا جب کہ میر، سودا اپنی اپنی انفرادیت کی بھول بھلیوں میں چکر کھاتے رہے نظیر کی شاعری اس عہد کے ریگستان میں ایک شاداب نخلستان ہے۔ نظیر جاگیردارانہ عہد کا شاعر ہے وہ زندہ رہنے کی مسرت سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ اور پھر دلیل دیتا ہے:

سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آ کر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

اور پھر کہتا ہے:

دکھ پا کے مر گیا کوئی سکھ پا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر ایک آگے مر گیا

نظیر کا سب سے زیادہ رچا ہوا رنگ فلسفیانہ لطف اندوزی میں نظر آتا ہے۔ اس کی نظمیں من موجی، بے خبری کا عالم، کوڑی نہ رکھ کفن کو اور ہر حال میں خوش شاعر کی صلی شخصیت کو نمایاں کرتی ہیں۔ نظیر غم روزگار کا علاج غم عشق میں نہیں بلکہ کیفِ عشق میں ڈھونڈتا ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں میں ڈوب کر تجربے کرتا ہے۔ نظیر کے یہاں جام حیات کی تہہ میں غم انجام کی تلخی کا احساس بھی ہے نظیر بہت

بڑا حقیقت نگار ہے وہ تنقیدی حقیقت نگار ہے وہ تنقید نگاری پیش کرتا ہے لیکن پھر بھی وہ انقلابی نہیں۔ وہ تو معلّمی کر کے پیٹ پالتا تھا اپنی آپ بیتی بیان کرتا ہے:

جو اہل فضل عالم و فاضل کہلاتے ہیں — مفلس ہوئے تو کلمہ تک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں — وہ جو غریب غرباء کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی مفلسی

نظیر انسانی کمزوریوں اور حماقتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ نظیر گداز دل کا مالک تھا۔ رازِ زندگی سے واقف تھا حقیقت آگاہی سے رواداری تھی انجام حیات کو سمجھتا تھا ظرافت کے ساتھ طنز بھی رکھتا تھا تنقید کرتا تھا اس کے ساتھ تجربہ بھی رکھتا تھا ڈرامہ نگار بھی تھا جو زندگی کے پلاٹ سے کردار چن لیتا تھا اس کی شاعری زندگی کی تال پر رقص کرتی معلوم ہوتی ہے۔ الغرض نظیر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کے تہہ میں شاعری کی جڑیں تلاش کرتا تھا۔

مشہور فرانسیسی محقق پروفیسر گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ نظیر کا پہلا دیوان ۱۷۸۰ میں شائع ہوا بعد میں راجہ بلاس رائے کے لڑکوں نے ۱۸۲۲ء میں شائع کرایا۔ معترفین نظیر کا کہنا ہے کہ نظیر کے ۳ مکمل دیوان تھے ۲ اردو میں ایک فارسی میں۔

''کل نفس'' ذائقتہ الموت نظیر کی اس پہلے کہی گئی نظموں کے نام اور ایک ایک شعر کا حوالہ پھر آیت کا ترجمہ'' کلیات نظیر نظیر اکبر آبادی کی بہت سی نادر و نایاب اردو، فارسی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے جس کو مولانا عبدالباری آسی نے مرتب کیا اور مشہور انشا پرداز مولانا المومن فاروقی نے ایک زبردست ادبی و تاریخی مقدمہ و تبصرہ لکھ کر پایا تکمیل کو پہنچایا۔ اس میں اردو غزلیات، مخمسات، مسدسات ترکیب بند و ترجیع بند، قطعات، رباعیات، قصائد مثنویات اور نظمیات ہیں:

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی — اب کس سے پوچھیے کون موا اور کس سے کہیے کون موئی
ڈرتی ہے رُوح یاروں اور جی بھی کانپتا ہے — مرنے کا نام مت لو، مرنا بری بلا ہے
دُکھ پا کے مر گیا کوئی سکھ پا کے مر گیا — جیتا رہا نہ کوئی ہر ایک آ کے مر گیا
آزادگی بھی دیکھ لے جنجال میں بھی شاد ہو — اس حال میں بھی شاد ہو اس حال میں بھی شاد ہو
گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور وں ہوا تو کیا ہو

نہ عشق نہ دکھ درد نہ آرام رہے گا — آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا
اتنے عرصے ہی میں کیا کیا ہم پہ گزری واردت — رہ چلے دنیا میں ہم بھی ایک دن اور ایک رات
نہ یہ چہلیں نہ یہ دھومیں نہ یہ چرچے بہم ہوں گے — میاں ایک دن وہ آوے گا نہ تم ہو گے نہ ہم ہوں گے
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا — اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا — دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبہ کام آوے گا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

نئے نصاب میں شامل نظم ''کل نفس ذائقۃ الموت'' یہ ایک قرآنی آیت ہے جو قرآن شریف سے چوتھے سپارے کی سورہ ال عمران کے ۱۹ویں رکوع کی آیت ۱۸۴ ہے اس کا ترجمہ ہے ''ہر نفس کو (جان کو) موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو پوری پاداش قیامت ہی کے روز ملے گی تو جو شخص دوزخ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل ہو گیا سو پورا کامیاب ہوا اور دنیا کی زندگی تو کچھ بھی نہیں مگر صرف دھوکے کا سودا ہے البتہ آگے اور آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں میں اور اپنی جانوں میں اور البتہ آگے کو اور سنو کے بہت سی باتیں دل آزاری کی ان لوگوں سے جو تم سے پہلے کتاب دیے گئے ہیں اور ان لوگوں سے جو کہ مشترک ہیں۔ (اس کی تفسیر کچھ یوں ہے) یہ جو فرمایا کہ دھوکے کا سودا تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دنیاوی زندگی سب کے لیے مضر ہے مطلب تشبیہ سے صرف یہ ہے کہ ''اصلی مقصود بنانے کے قابل نہیں'' آزمانے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے حوادث تم پہ وقتاً ہوا کریں گے اس کو مجازاً آزمانا کہہ دیا ورنہ اللہ تعالیٰ آزمانے کے حقیقی معنی سے پاک ہے کیوں کہ وہ عالم الغیب ہے۔ نظیر نے یوں تو مخمس اور مسدس لکھے ہیں یہ نظم ہیت کے اعتبار سے ترجیع بند ہے۔ ترجیع بند میں ہر بند کے آخر میں ایک شعر یا مصرع بار بار لایا جاتا ہے مثلاً نظیر اکبر آبادی کی اکثر نظمیں مخمس ترجیع بند ہیئت ہیں۔ جیسے ان کی یہ نظم ''کل نفس ذائقۃ الموت'' کے ہر بند کا آخری مصرع ہر بند کے آخر میں ہے:

جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مر گیا

دنیا میں اپنا جی کوئی بہلا کے مر گیا — دل تنگیوں سے اور کوئی اُکتا کے مر گیا
عاقل تھا وہ تو آپ کو سمجھا کے مر گیا — بے عقل چھاتی پیٹ کے گھبرا کے مر گیا
دکھ پا کے مر گیا کوئی سکھ پا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مر گیا

تھی جیسی جس کی قدر وہ بتلا کے مر گیا — جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مر گیا
دو دن کی شان ہر کوئی دکھلا کے مر گیا — جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مر گیا

اشاریۂ اردو

مرتب

مصباح العثمان

صفحات: ۱۸۰ قیمت: ۱۰۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

محمد ناصر شمسی ☆

جمیل الدین عالی کی کتاب — بس اک گوشۂ بساط - ایک تاثر

۵۰۲ صفحات پر مشتمل خاکے، مضامین اور تاثرات اور اس کے علاوہ اردو غزل کے حوالے سے انگریزی میں تحریر شدہ مقالے کے ۲۳ صفحات پر مبنی ''بس اک گوشۂ بساط'' ایسی خاصی ضخیم کتاب کا مطالعہ (آج کے صنعتی دور میں تیزی سے دوڑتے وقت کی کمیابی کے ضمن میں تو یقیناً) آسان امر نہیں ہے۔ مگر ایسے میں ایک عام سا قاری بھی کہیں سے تو وقت لائے گا، کچھ تو کرے گا، کتاب جب قاری کو اپنے نظارۂ جمال میں اُلجھالے، خود کو پڑھوالے — اُف اس قدر... Readability ایک قاری، ایک ادیب، خاکہ نگار یا ایک نثر لکھنے والا اگر یہ دعا بھی مانگ لے، یہ خواہش بھی نمودار ہو جائے کہ کاش عالی جی نثر نگار ہی ہوتے تو ایسی نہ جانے کتنی تحریریں، کتنی کتابیں اور کس قدر ''گوشہ ہائے بساط'' ہمیں دستیاب ہوتے۔ ہمارے ہاں تو پہلے ہی نثر کا قحط ہے اور شاعری کے خوشہ گندم کے سامنے ہماری نثر تو بس کچھ ہے کہ نہیں ہے؟ کا کھیل ہے۔ ''بس اک گوشۂ بساط'' میں عالی جی کے ہم عصر ادیب اور شاعر فن اور شخصیت کے حوالے سے ان کے احاطۂ قلم میں ہیں۔ خود عالی صاحب کا اثاثۂ ادب ان کی شخصیت کا مظہر ہے۔ بقول پروفیسر حسن عسکری ''عالی کی شاعری ان کی شخصیت کا مکمل اظہار ہے، نہ یہ آگے نہ وہ پیچھے۔ قطعی یہی بات عالی صاحب کی نثر کی بابت بھی کہی جاسکتی ہے۔ ادبی مسافت کی چھ سات دہائیاں، روز و شب، زندگی کے دروبست، روزگار، رشتہ داریاں، خود اپنا گھر اور اُس سے جڑے معاملات، دوست احباب کی رفاقتیں، زندگی کا رکھ رکھاؤ، مطالعات و مشاہدات [illegible]، سماجی، معاشی اور معاشرتی ہمہ گیری، سماجی و سیاسی اور تہذیبی منظر نامے، وقت کی کروٹیں، انسانی رویوں کی قلابازیاں، شخصیت کے اپنے اسرار و رموز اور پھر تخلیقی اُپج کہ کتنا دیکھا، کس قدر محسوس کیا، کتنا Conceive کیا اور پھر کس طرح تخلیق کیا جہاں تحریر میں پایا جانے والا تنوع اور بحیثیتِ مجموعی اس کا تخلیقی معیار، مطالعاتی، مشاہداتی، تجرباتی اور تخیلاتی مواد کی کوکھ سے ہی جنم لیتا ہے وہیں ذہنی رسائی کا پھیلاؤ، طلبِ حُسن اور زندگی کی کشمکش کے نتیجے میں اُمڈ آنے والا دُکھ ہی ادبی تخلیق کے Pre-Requisites ہوتے ہیں اور ان کا متوازن Blend ہی اثر پذیری کا حامل ہوتا ہے۔ یہ فکری توازن ہی احترامِ انسانیت سے لے کر بقائے انسانی تک کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ امن و آشتی اور فلاح و بہبود کے حوالے سے اگر کچھ منظر نامے موجود ہیں تو وہ اسی کے رہینِ منت ہیں۔ انسانی فکر کے ایسے متوازن زاویے اور ان کی ہمواریاں اور اَن گنت Dimensions ہی حیاتِ انسانی کو ایک ترتیب

☆ اے۔۲۳۵، گلستانِ جوہر نمبر ۱۵، کراچی

مہیا کرتے ہیں، انسانی رشتوں اور فکری ہم آہنگی کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں اور فکرِ انسانی کا اعجاز بھی یہی ہے کہ وہ حیات و کائنات کی بقا اور اس کی نمو کے ضمن میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کی سعیِ مسلسل جاری رکھتی ہے جب کہ انسانی فکر کے اس اعجاز کا مرکزی نکتہ خود انسان ہی ہے۔ اسی لیے ہر انسانی کاوش اور اس کی کارفرمائی ایک جانب اگر توجہ طلب ہے تو دوسری طرف اپنی ہیئت میں ایک تازہ کاوش اور عملی جہت کا آغاز بھی قرار پاتی ہے اور یوں خراجِ تحسین کی سزاوار ٹھہرتی ہے۔

ادیب سہیل نے اس حوالے سے خوب کہا ہے کہ ''ارمغانِ عالی'' اور ''دنیائے ادب'' میں دوسروں کی فکر و دانش عالی صاحب کو سمجھنے کے کام آئی اور ''بس اک گوشۂ بساط'' میں خود عالی صاحب کی فکر و دانش دوسرے مشاہیرِ ادب کی ذات و کائنات کو سمجھنے میں معاون ہوئی ہے۔

بہرحال یہ طے ہے کہ انسان کا اصل کام یا بنیادی فریضہ یہی ہے کہ انسان بنا رہے اور اس ضمن میں ماحول کی تجسیم بھی کرتا رہے۔ عالی صاحب نے انسان ہونے اور اس منصب اور حیثیت پر قائم رہنے کے حوالے سے جو صورتیں اختیار کیں اور جس طرح کے ماحول ترتیب دینے کی سعی کی اُس میں ان کی ادبی حیثیت محکم ہے۔ ''بس اک گوشۂ بساط'' میں جن شخصیات کا ذکر ہے وہ انسانی فلاح کی جانب اپنی کاوشوں کو رواں رکھنے کی سعی میں مصروف تھے اور عالی جی ان کے ہم قدم اور شریک کار تھے۔ انفرادی طور پر یہ سب ہی اجتماعی کام کر رہے تھے۔ انسانی اقدار کے حوالے سے بصیرت افروزی، تہذیبی اور سماجی شعور کا ارتقا اور انسان دوستی ان سب کا مشن رہا۔ خاکوں، تذکروں اور مضامین کے ذریعے شخصیات اور ان کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ چھ دہائیوں سے زائد عرصہ پر مشتمل ادبی ماحول اور اس کی روئیداد بھی فراہم کی ہے۔

فنی اعتبار سے خاکہ نگاری کوئی آسان صنفِ ادب نہیں ہے۔ چہرہ اور اس پر سجی بولتی آنکھیں، انسان کی اصل زبان یعنی Body Language کے علاوہ شخصیت کے ذہن کی آنکھوں میں بھی جھانکنا ہوتا ہے، جب کہ خاکہ نگاری ایک احتیاط کا تقاضا بھی کرتی ہے گویا جب آپ کسی شخصیت کو اپنا موضوع بنائیں تو تحریری گفتگو اس نوع کی ہو کہ آپ کے سامنے جو بھی شخصیت اس لمحہ موجود میں زندہ ہو وہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے بلکہ شاید آپ کی اپنی ذات سے بھی اہم تر، دوم اپنے بیان میں توازن ایک لازمی امر ٹھہرتا ہے، آپ کہیں انگوٹھا رکھنے کے مجاز نہیں ہیں۔ اکثر خاکہ نگار ممدوح کی خوبیوں اور برائیوں کے بیان میں توازن کی کوشش کرتے ہیں مگر اس ضمن میں عالی جی کا کہنا ہے ''کہ میں خود بالکل بے عیب ہوتا تب شاید کسی عیب دار پر انگشت نمائی کرتا لیکن اگر وہ عیب انسانیت کے لیے سخت نقصان دہ نہ ہو رہے ہوں تو ان کی پردہ پوشی ہی بہتر ہے۔'' (فنی لوازم کو گر علاحدہ رکھ دیا جائے تو یہ ایک بڑی سوچ ہے)۔

خاکہ نگاری کی ایک خصوصیت بہرحال شخصیت کا مجموعی تاثر ضرور ہے مگر یہ سوانح حیات نہیں ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ تذکرہ نگاری سے بہت آگے کی چیز ہے اور یہ بھی کہ مقصد خاکہ لکھنا ہونا چاہیے، خاکہ اُڑانا نہیں۔ خاکہ نگاری کے ان اصولوں کے تناظر میں ''بس اک گوشۂ بساط'' کے خاکے بلاشبہ قاری کے لیے ایک خوش گوار تحیر کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

دوسری جانب تبصرہ نگاری میں تجزیہ، محاکمہ اور تعین قدر کی ناقدانہ ذمہ داریاں نبھانا از بس ضروری نہیں اور یہ بھی کہ تبصرہ نگار

آگے بڑھ کر فیصلہ دینے لگے کہ اُس کے زیرِتبصرہ کتاب کی قابلِ ذکر خصوصیات یا پھر اُس کی فروگزاشتیں کس حد تک کتاب کی مقصدیت کو اُجاگر کرتی ہیں یا کہ پھر Readability کے لیے سودمند نہیں ہیں۔ تبصرہ نگاری کے ان مروجہ اور مسلمہ اصولوں اور زاویوں کے اعتبار سے ''بس اک گوشۂ بساط'' پر نظر ڈالیے اور پھر دیکھیے عالی جی کے قلم نے ان فنی ذمہ داریوں کو کس قدر اہم جانا ہے اور ان لوازم کی پاسداری تحریر کو شگفتہ اور پُراثر بنانے میں کس قدر معاون ثابت ہوئے ہیں۔

''بس اک گوشۂ بساط'' کے فلیپ پر درج سلیم احمد کی مختصر مگر جامع رائے عالی جی کی شخصیت اور فن کے لیے مستند معلوم ہوتی ہے۔ سلیم احمد کہتے ہیں ''جمیل الدین عالی اپنی زندگی کے متنوع تجربات کی کثرت کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں اور ہم عمروں سے بڑھا ہوا ہے۔ اس کی زندگی کثیرالجہات اور کثیرالواردات ہے۔ اس نے زندگی کے بہت سے نشیب وفراز دیکھے ہیں اور بے شمار روح فرسا اور جاں گداز مرحلوں سے گزرا ہے۔ اچھے، بُرے، پست، بلند، شریف ہر طرح کے تجربات سے دوچار ہوا ہے۔ پھر وہ احساس کا آدمی ہی نہیں، ذہن کا آدمی بھی ہے۔ وہ محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ سوچنا بھی جانتا ہے۔ سلیم احمد کی یہ رائے عالی جی کے عمیق مشاہدے، گہرے تجرباتی مرحلے، ان کی وسعت نظری، زندگی کے ادراک اور فکری پھیلاؤ کے ضمن میں ان کا اعلانیہ بیان ہے۔

عالی جی اپنی شخصیت میں پُرزور اور متحرک رہے ہیں اور اپنی سوچ اور عمل کے اعتبار سے Pro-Active اور Prudent شاید اسی لیے زندگی کو قریب سے دیکھنے میں کامیاب رہے، تجرباتی مراحل سے گزرے اور بہت سے سفر کیے، بے شمار لوگوں سے ملے، گفتگو کی، مباحثہ کیا، مکالمہ کیا، زندگی کو پڑھا اور پرکھا، اس طرح وژن میں وسعت پیدا ہوئی اور پھر نتیجتاً ایک فکری Spark پیدا ہوا۔ یہ سب کچھ ہمیں ''بس اک گوشۂ بساط'' میں نظر آتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے! میر خلیل الرحمٰن پر مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''اگر کسی انسان کی خوبیاں اس کی کچھ حقیقی یا مفروضہ کمزوریوں سے بہت زیادہ ہوں تو اُجاگر کن کن کو کیا جائے۔''

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ''مثالیں بڑے آدمیوں سے ہی لی جاتی ہیں گو ایسی مثالوں کا مقصد انھیں اپنی موضوع شخصیت کا ہم سطح کر دینا نہیں ہوتا، سبق لینا ہوتا ہے۔''

اختر الایمان کے خاکہ میں اندازِ تحریر کی سادگی دیکھیے:

> ''اور یہ محنت آج سے نہیں ہے، زلفیہ اور زلفیہ کے بچوں کی وجہ سے نہیں ہے، کام کرنے کی محیرالعقول عادت سے ہے، جب یہ کالج میں پڑھتا تھا اور ٹیوشن کرتا تھا، جب یہ سپلائی میں کام کرتا تھا بلکہ جب یہ بھینسوں کو ہوا خوری کراتا تھا۔ یہ بات کافی ہاؤس میں بیٹھ کر دنیا بھر کو گالیاں دینے والے نہیں سمجھیں گے۔ نہ وہ جو کچھ کہے سُنے بغیر اپنی عظمتوں کا شکار ہوئے جاتے ہیں۔ محنت بڑی سخت چیز ہے، ریڑھ کی ہڈی دوہری تہری ہو جاتی ہے، بال سفید پڑ جاتے ہیں مگر اس سے کیا کچھ بچ

جاتا ہے، یہ سب کا دل جانتا ہے۔''

محشر بدایونی پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''ایک Thesis اس موضوع پر لکھا جائے کہ ہم شعرا کی بڑی تعداد میں (میر و غالب سے اب تک) اپنی فکر، خودداری، انسان دوستی کے باوجود اتنے سخت کرداری تضادات کیوں ہوتے ہیں جو خود ہمیں، ہمارے متعلقین، احباب اور معاصرین کو دُکھ اور بعض اوقات عملاً سخت ضرر بھی پہنچاتے ہیں۔''

عالی جی ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''ہمارے یہاں گروپ بندی، خود پرستی، اردو ادب میں بھی صوبائیت زدگی اپنی گہرائی کی آخری حدیں چھونے لگی ہے۔ یوں ''اپنوں'' کی کردار کشی میں لاہور بھی کم نہیں مگر بہرحال لاہور شہرِ ثقافت ہے، روایت رکھتا ہے۔ وہاں ناصر کاظمی کو بھی اس کی اپنی زندگی میں مان ہی لیا گیا۔''

یہیں اسی مضمون میں تحریر کرتے ہیں:

''کراچی اپنے دور زرّیں کے بعد معاصرین کے باب میں ایک دم جو لذتِ زوال (Askance to decadance) کا شکار ہوا ہے تو آج تک اس کے زہریلے پھیلاؤ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔''

مزید کہتے ہیں:

''بعض وہ شعرا جو اچھے خاصے کہنے والے تھے بلند مقامی کی جہد میں اس تیزی سے اور ایسے جارحانہ انداز میں دوڑے کہ اپنے سنیئرز کو بے گناہ روند ڈالا۔''

ذرا یہ بھی ملاحظہ کیجیے:

''اس مضمون میں جو کہ بہرحال ادب کے حوالے سے لکھا جارہا ہے پاکستانی سیاست داں جیسے اسفل طبقے کا حوالہ بھی محشر صاحب، کسی بھی ادیب اور خود اس مضمون کی توہین ہے۔''

سید حامد کے مضمون میں یہ جملہ ہم سے کیا کہتا ہے؟

''کسی کا صرف ایک اچھا آدمی ہی رہنا پوری انسانیت کے لیے بڑی تسلی کا باعث ہوتا ہے۔''

رفعت سروش پر لکھے ہوئے مضمون کا یہ اقتباس ہماری روزمرہ کی ہستی کا اعمال نامہ کس قدر سادگی اور دردمندی سے سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ دیکھیے اور دردِ دل سے بچیے:

''فرض کیجیے اگر ہم دونوں ایک ہی ملک اور شہر میں رہتے اور ایک دوسرے سے آئے دن کا واسطہ پڑتا تو کیا میں اور وہ ایک دوسرے کو بھی رنج نہ پہنچاتے؟ کیا ہمارے باہمی معاملات ہمیشہ صاف رہتے؟ کیا ہم ایک ہی ذہنی رویہ اختیار کیے رہتے؟ کیا ہمارے رویے، غلطیاں، ''جرائم'' ہمیں ایک

دوسرے پر سخت معترض نہ رکھتے؟ اس حد تک کہ دوستی ہی ختم ہو جاتی! اب تو وہ خالص اچھی یاد ہے (ممکن ہے میں اس کے لیے کوئی خاص اچھی یاد بھی نہ رہا ہوں۔)

اخلاقی قدروں سے سجے ہوئے آدمی کے لیے عالی جی کا زاویۂ نظر ملاحظہ کیجیے۔

''بے شمار غیر معمولی تو بہت سی برائیوں کی پوٹ بھی ہوتے ہیں، کوئی بڑا، کم بڑا معمولی، کوئی بھی آدمی اچھا رہے وہ میرے لیے بہت سے مشاہیر اور بڑوں کی نسبت جو اپنے آدمی نہ ہوں کہیں زیادہ محترم اور یاد آنے جانے کے قابل ہے۔''

ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''نیاز صاحب کی تمام صفات یا بیشتر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو منتقل ہو گئیں مگر اتنے بڑے دریا میں تھوڑی دیر تیر لینا بھی تیرنے والوں کو کیسی کیسی لہروں، کیسی کیسی گہرائیوں اور کیفیتوں کے تحفے بخش دیتا ہے۔''

احمد ندیم قاسمی پر سیمینار منعقدہ ابوظہبی میں کہتے ہیں:

''لوگو! دوسرے ''ستاروں'' پر اتنا وقت اور روپیہ خرچ کرتے ہو کچھ وقت اور روپیہ ادب کے سورجوں اور چاندوں کے لیے بھی سہی... فائدہ بالآخر تمھارے اور تمھاری نسلوں کے ذہن ہی اُٹھائیں گے۔''

یہاں ایک شاعر ایک ادیب ہونے کے ناطے عالی جی کا مطمع نظر ملاحظہ ہو:

''حضرت بڑے لکھنے والے تو پیدا ہو ہی جاتے ہیں اور طرح طرح کے بڑے بھی۔ مگر ''میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا۔''

بلاشبہ خدا کے بندوں سے پیار کرنے والے لوگ کہاں ہیں؟ کہاں سے لائیں؟

''فرشتوں کا لکھا'' میں اُجڑتی دِلّی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اور میاں دلّی کی بات کچھ جُدا نہیں، یہ تو ہمیشہ ہوا ہے۔ جب اتنا بڑا انقلاب آتا ہے تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ انقلاب کے فائدے الگ ہیں۔ جب عقل مند کہتے ہیں تو ضرور ہوں گے۔ مگر یہ بھی تو ہے کہ ان بڑے فائدوں کے چکّر میں چھوٹی چھوٹی جمی جمائی تہذیبیں، شرافتیں اور خوب صورتیاں کیسے ایک دم تباہی اور گمنامی کے غاروں میں دھکیل دی جاتی ہیں۔''

''ادیب کی ڈائری'' کے عنوان تلے یہ دو جملے ملاحظہ کیجیے:

''پاکستانی ادیب پڑھنے والوں کو مایوس نہیں کریں گے۔ مگر پڑھنے والے بھی ادب پڑھنے کی عادت ڈال لیں تو دونوں کے لیے منزل تک پہنچنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔''

پاکستان رائٹرز گلڈ پر لکھتے ہوئے اپنے مضمون ''گلڈ کہانی'' میں کہتے ہیں:

''عہدہ داری کے لیے انتخابی نظام قائم کیا'' (بارہ برس بعد یعنی ۱۹۷۰ء میں میرے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۷۵ء آتے آتے اس نظام کے مسخ ہوجانے سے گلڈ مفلوج و معطل ہوگیا۔)

اکادمی ادبیات کے ضمن میں عالی جی بہرحال پُر اُمید نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''اُمید ہے کہ موجودہ اکادمی جو نہ ہمارے مجوزہ دستور کے مطابق ہے نہ فیض رپورٹ کی تجویز کے مطابق، نہ ذرا بھی آزاد و خودمختار ہے، انشاءاللہ کسی دن مناسب اور آزاد خطوط پر استوار ہوجائے گی۔''

''بس اک گوشۂ بساط'' میں جشن خسرو کی بین الاقوامی کانفرنس کے حوالے سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''ویسے یہ اظہارِ انفرادیت کا ایک پرانا طریقہ ہے کہ بیٹھے بٹھائے صرف اپنے وجود کا احساس دلانے کی خاطر اجماع سے اختلاف کا ڈھنڈورا پیٹ دیا جاتا ہے۔''

''ایک تو یہ ہے کہ اس زمانے کے پریشان کُن سیاسی سرکس میں اگر ذہنی غذا اور تازگی کا کوئی سہارا رہ گیا ہے تو وہ تھوڑا بہت ثقافتی دال دلیا ہے۔''

پاکستان اور پاکستانیت کے ضمن میں دیکھیے: چند اقتباسات!

''پاکستان خود اُسی ہزار سالہ مسلم اقتدار کی ایک درخشاں پیداوار ہے۔''

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

''اب اہل دل ثقافتی کارکنوں پر لازم ہے کہ وہ پاکستانی ثقافت کے ذریعہ پاکستانی اکائی کو مضبوط بنانے کے لیے کام کریں۔''

''آج پاکستان کے مسائل صرف پاکستان ہی میں زیرغور نہیں رہتے بلکہ ہمارا غریب اور محبوب ملک بین الاقوامی جنگ اقتدار میں ایک مورچہ بنادیا گیا ہے۔''

مزید کہتے ہیں بلکہ ہر شخص سے سوال کرتے ہیں:

''کیا اس افراتفری میں خاص پاکستانی نقطۂ نظر، خالص پاکستانی اندازِ فکر یعنی خالص پاکستانیت اُبھرنے کا امکان باقی رہ گیا ہے؟ کیا آپ آج اس کے لیے کچھ کام کرسکیں گے؟

اس ضمن میں اچھی، سچی اور بڑی سوچ دیکھیے اور اُمید بھی!

''اس میں شک نہیں کہ یہ باتیں بڑی ہیں اور ہم لوگ چھوٹے ہیں لیکن یہ ہمارا ایمان ہیں اور ایمان ہمیشہ بڑا ہوتا ہے۔ عقیدے ہمیشہ بڑے ہوتے ہیں۔ اُمیدیں، آرزوئیں، اُمنگیں ہمیشہ بڑی ہوتی ہیں۔''

پاکستانی صحافت کے بارے میں کیا دوٹوک بات کہہ گئے ہیں!

''نہ معلوم یہ نام نہاد آزادی تحریر کا زمانہ کتنے دن اور باقی رہے گا۔ آج کی آزادی تحریک ایک

مصنوعی سراب ہے یعنی یہ منظرنامہ صرف سراب ہے بلکہ مصنوعی سراب بھی ہے۔''

ہمارے دوست اور پڑوسی ملک میں بولی جانے والی زبان وادب یعنی چینی ادب کے اردو تراجم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''لیکن پاکستانی ناشروں نے اتنے بڑے ہمسائے، اتنے مضبوط دوست اور اتنی بڑی زبان کے اتنے پھیلے ہوئے ادب پر اس کے حق کے مطابق کیوں توجہ نہیں دی جب کہ وہ مغرب کی بعض پست ترین تخلیقات کو مسلسل اہمیت دیئے جاتے ہیں؟''

اردو زبان کی توسیع کے موضوع پر منعقدہ مذاکرہ میں عالی جی کی رائے دیکھیے۔ فرماتے ہیں:

''چناں چہ میری رائے تو یہی ہے کہ اردو کی آرائش اور تزئین کی بجائے اس کی صحت وسلامتی کو زیادہ ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔ زیادہ بناؤ سنگھار اور گھونگھٹ بازی سے دُلہن گھٹ جاتی ہے۔''

''پاکستان کی پہلی اردو یونی ورسٹی — عظیم امکانات'' کے زیرعنوان اپنی چالیس سالہ ریاضت اور محنت کے نتیجے میں اُبھر آنے والی اُمیدوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یونی ورسٹی سے الحاق سب کالجوں میں بہت بڑی حد تک نصابی ہمواری برقرار رکھے گا اور کئی طریقوں سے باہمی تعارف وتبادلہ افراد وافکار کا بھی جس کا ایک نتیجہ ایک حسین قومی یک جہتی نکلے گا۔ قومی یک جہتی، بالغ نظری، اسلامی فکر، ضروری عالمی روشن خیالی، اپنا قصبہ اپنا گھر چھوڑے بغیر بہت کم خرچ پر۔''

''بس اک گوشۂ بساط'' میں تاریخ اور فلسفہ سے متعلق عالی جی کے نقطۂ نظر اور ایک دو اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

''تاریخ بھی بادشاہوں کی سوانح ہی ہے۔ اس جابجا، خلافتِ راشدہ کے بعد سے جو باتیں لکھی جارہی ہیں وہ نہ صرف مسلمانوں کی تاریخ بلکہ بادشاہوں کے حالات اور شاہی سوانح عمریوں ہی کی ایک شکل ہے، تحریک اسلام کی تاریخ نہیں ہے۔''

''اغلباً اگلے دو ڈھائی سو برس میں ابنِ خلدون کا نظریہ عصبیت محض ایک مردہ نظریے کی صورت میں تاریخِ فکر کے ریکارڈ پر رہ جائے گا۔''

''ابنِ خلدون نے عورتوں کی تعلیم پر بہت زور دیا اور اس فکر کے اثرات یورپ پر بہت گہرے ہوئے۔ اسے ایک عظیم سماجی کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔''

کتاب میں موجود پہلی کینیڈین اردو کانفرنس منعقدہ ٹورنٹو ستمبر ۱۹۸۲ء انگریزی میں پیش کردہ مقالہ پڑھنے کی چیز ہے۔ اردو غزل کے حوالے سے ایک مستند ادب پارہ، وقیع، جامع اور عقدہ کشا۔

ملاحظہ کیجیے۔ مثلاً (چند مختصر اقتباسات)

"Even to day it is the most lively and prestigious form of Urdu poetry which has been weathering all sorts of storm, the vicissitudes of time, and preserves to this day all its excellence, niceties, delicacy, symbolism, suggestiveness and evocative etherealism. It owes its leaven to the fusion, internmixture and amalgamation of the best poetic traditions of Arabia and Iran, but it is not a mere verse from; it is the articulation and symbol of our culture."

میرا ذاتی خیال ہے کہ عالی جی غزل کے مستقبل کے بارے میں یقیناً پرامید ہیں جب ہی انھوں نے اسی مقالے میں یہ رائے دی ہے:

"Urdu Ghazal is reflecting gracefully and effectively the changing tendencies and instant demands of time affording ample proof of its adequacy and fitness as a form of expression.
It does seem to have a great future."

''بس اک گوشۂ بساط'' کے مطالعے سے بلاشبہ عالی جی کی شخصیت اور فن تحریر دونوں قاری پر اثر چھوڑتے ہیں ان کی نثر سادہ، برجستہ، براہِ راست اور نرم خُو ہے۔ ذائقہ میں سچ کی کڑواہٹ تو ہر کوئی محسوس ہی کرتا ہے۔ ہاں! کہیں کہیں اُن کا Natural Child جوان میں موجود ہے جو کہ Normalcy کا ایک ثبوت بھی ہے پکارنے لگتا ہے، خواہش شدید کی لمحاتی کیفیت میں "I" یعنی ''میں'' بولتا ہے۔ یقیناً یہ وہ احساس ہے جو قوت مشاہدہ اور تخیل کی طاقتوں سے بھرپور، تجربات کی بھٹی میں کندن بننے والے ذہن وجسم کے کونوں کھدروں میں دُبکا رہ جاتا ہے۔ فکری پھیلاؤ کا کرشماتی اعجاز یہ بھی ہے کہ تشنگی کا عنصر باقی رہتا ہے۔ اسی بنا پر بڑے آدمی کی بڑائی کبھی اس خلا کو پُر کرنے کی خواہش شدید میں ابتلا کا شکار ہونے لگتی ہے۔ مگر بڑے آدمی کی بڑائی بھی یہ ہے کہ وہ اس پر سوار رہے، اس کو قابو میں رکھے اور اس خلا کو پُر کرنے کا فریضہ وقت کے دھارے کے سپرد کردے۔ عالی جی حقیقتاً اس امر سے واقف ہیں اسی لیے "I" کی Exhibition کو فوراً ہی Negate کرتے نظر آتے ہیں۔

''بس اک گوشۂ بساط'' میں عالی جی نے اپنی حُسن پرستی اور عشق کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ بلاشبہ وہ ایک ایسے شخص ہیں جو حُسن شناس ہے، حُسن شناس فطری طور پر حُسن پرست بھی ہوگا، ایسا شخص جو اسرار حُسن سے آشنا ہوجاتا ہے بار بار عشق کرتا ہے۔ یہ انبساط عشق بڑی انرجی ہے، امکاناتِ ہستی کو متوازن رکھتی ہے اور اس توازن پر براجمان رہنے والے کی ساری زندگی عشق میں ہی گزرتی ہے۔ اس اعتبار سے کتاب کا حسن اور بھی نکھر گیا ہے۔

بحیثیت عاشق عالی جی کا معاملہ اور ہے مگر ادبی بوطیقا کے حوالے سے عالی جی ایک Angry Man ہی کہلائیں گے۔ ایسے Angry Man کو اگر ہم نے دولہا بنادیا ہوتا تو شاید ہم ان سے کافی زیادہ کام لے سکتے تھے۔ مگر ہم تو اپنے Human Resource کو برباد کرنے والوں میں سے ہیں، آتش حسد میں رکھ کر پھونک دیتے ہیں کیوں کہ یہ ہمارا محبوب اور دلکش مشغلہ ہے Curriculor نہیں تو Extra curriculor ہی سہی۔

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

اردو تاریخ ومسائل

سید روح الامین

صفحات ۱۹۲ قیمت:/۳۰۰ روپے

ناشر: عزت اکادمی گجرات

مبصر: محمد احمد سبزواری

سید روح الامین صاحب تحریکِ نفاذ اردو کے ایک سرگرم کارکن ہیں، اس سلسلے میں ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب بھی اسی کی ایک کڑی ہے جس میں انھوں نے سات مشاہیر کی قیمتی تحریروں کے ساتھ اپنے پانچ مضمون ہی شامل کیے ہیں، پہلا مضمون ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کا اردو زبان کے تاریخی خاکے پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے عرب و ہند کے قدیم تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ ملابار کے عرب النسل مسلمان جو موپلا کہلاتے ہیں ان کی مادری زبان ملیالم ہے ان کا مذہبی ادب ملیالم ہونے کے باوجود عربی رسم الخط میں ہوتا ہے اور یہی صورت پانڈی چیری، ترچناپلی، مدورا اور ساحل کارومنڈل پر عربوں کی جو بستیاں ہیں ان کی زبان تامل ہے مگر ان کا دینی سرمایہ ٹامل میں ہونے کے باوجود بعض تعرفات کے ساتھ عربی رسم الخط میں ہے۔ سندھی کا اصلی رسم الخط Landa میں نہایہ گورمکھی اور ناگری میں یہی رہا لیکن مسلمانوں کے آنے کے بعد اس کا رسم الخط فارسی میں ہوگیا اور یہی صورت ملتانی زبان کی رہی، انھوں نے البیرونی اور پرتھوی راج کے وزیر اور شاعر چند بردائی کی کتابوں سے یہ ثابت کیا ہے، اوّل الذکر کے ہاں مامون الرشید کے اس دارالترجمے کا ذکر کیا جہاں یونانی اور لاطینی زبانوں کے ساتھ ہندوستانی علوم جو سنسکرت اور مقامی زبانوں میں تھے کا یہی ترجمہ ہوا اور اس کے لیے ہندوستان کے عالموں کو بلایا گیا اور مختلف علوم کی بہت سی اصطلاحات کو معرب بنا گیا یا ویسے ہی اختیار کرلیا گیا اور ظاہر ہے کہ بول چال میں ہی بہت سے ہندوستانی زبانوں کے لفظ بغداد کے بازاروں میں عام ہوگئے ہوں گے۔ انھوں نے شیوخ، سلطنت دہلی کے بادشاہوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ان کے ذریعے سے آہستہ آہستہ ایک نئی زبان وجود میں آتی رہی جو بعد میں اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالستار نے اردو میں دخیل آوازوں کا ذکر کیا ہے اور زبان کے صوتی نظام سے بحث کی ہے۔ ڈاکٹر عتیق حمد صدیقی نے زبان کیا ہے؟ پر اظہارِ خیال کیا ہے اور ان کی بحث کا لب لباب یہ ہے کہ (۱) زبان ترسیل خیال کا ذریعہ ہے (۲) جسے ایک سماج کے افراد استعمال کرتے ہیں۔ (۳) یہ استعمال علامتوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ (۴) جو صوتی اور

(۵) خود اختیاری ہوتی ہیں اور (۶) یہ علامتیں ایک ضابطے میں مربوط ہوتی ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے علم زبان کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے جن اصحاب کو زبان کی تاریخ سے دلچسپی ہو انھیں یہ مضمون ذرا غور سے پڑھنا چاہیے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اردو املا کے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زبان آوازوں سے بنتی ہے اور بولی جاتی ہے۔ ''لپسی'' حروف سے بنتی ہے اور پڑھی جاتی ہے۔ چناں چہ زبان اور لپسی کا رشتہ دراصل حرف وصوت کا رشتہ ہوتا ہے اور یہ رشتہ صرف اسی صورت میں مستحکم ہوسکتا ہے جب ہر آواز کے لیے ایک جداگانہ حرف تقرر ہو، اس کے برعکس جب ایک آواز کے لیے کئی کئی حروف یا کئی کئی آوازوں کے لیے ایک حرف مقرر ہوگا تو جو بولا جائے گا وہ پڑھا نہیں جاسکے گا اور جو پڑھا جائے گا وہ بولا ہوا نہیں ہوگا۔ چناں چہ لپسی کی خام کاری اور غلط نگاری کی وجہ سے پڑھے لکھوں کا تلفظ بگڑ جاتا ہے، پھر انھوں نے بڑی تفصیل سے اس کی وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے علم زبان کے مطالعے کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے ان کے خیال میں ہندوستان میں زبان بالخصوص صوتیات کا قدیم دور میں جس صحت سے مطالعہ کیا گیا ہے اس پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ دہدی زبان میں سُر کی اہمیت تھی، ہون اور یکیہ میں اس کے نتروں کو صحیح تلفظ اور زیر و بم کے ساتھ پڑھنا ضروری تھا ورنہ وہ بے اثر ہوجاتے، اس مقصد سے صوتیات پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس کے بعد انھوں نے منزل بہ منزل ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جن ویدوں کے جملوں اور مرکبات کے اجزا الگ الگ کرکے لکھے جاتے تھے، اس کو پڈپاتھ کہا گیا پھر پراتی شاکھیہ نام کی کتابیں لکھی گئیں جن میں ویدوں کے زیر و بم یعنی سر درجے کو ضبط تحریر میں لایا گیا تھا۔ ان میں ویدک سنسکرت کی آوازوں کی گروہ بندی کی گئی پھر شکشایا شکچھا نام کی کتابوں میں آوازوں کا مزید مطالعہ کیا گیا اس طرح کی ۴۰ کتابیں موجود ہیں۔ پھر انھوں نے ساتویں یا چھٹی صدی ق۔م۔ سے ہندوستانی ماہر لسانیات کا تفصیلی ذکر کیا اور اسی ذیل میں مغرب کے علما کا تذکرہ کیا ہے اور سنسکرت، یونانی اور لاطینی کا ماخذ ایک ہی ہے۔ ان مختلف مصنفین اور کتابوں کا ذکر کیا ہے جس میں مختلف زبانوں کا تقابل یا مطالعہ کیا گیا ہے۔ قدیم ہند آریائی یعنی ویدک اور سنسکرت پر کام کرنے والوں کے تفصیلی ذکر کے بعد وسطی ہند آریائی، بنگالی، اُڑیا، آسامی، مراٹھی، گجراتی، جنوبی ہند کی زبانوں، سندھی، کشمیری، پنجابی، نیپال، راجستھانی زبانوں پر جو کام ہوا ہے اس کا مختصراً تذکرہ کیا ہے، انھوں نے لسانیات کے چار دبستانوں (۱) جینوا اسکول اور فرڈی نینڈی ساسور (۲) فرانسیسی اسکول (۳) روسی اسکول (۴) پراگ اسکول کے ساتھ امریکی اسکول اور یورپ کے ماہرین ہند کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ مضمون بڑی تحقیق سے لکھا گیا ہے اور اس جانفشانی پر جین صاحب قابل مبارک باد ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ انھوں نے کہیں عربی کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے کہ ہون اور یکیہ میں نتروں کو صحیح تلفظ اور زیر و بم کے ساتھ پڑھنا ضروری تھا، اسی طرح قرآن کی تلاوت پر نہ صرف زیر، زبر، پیش کا بڑا لحاظ رکھا گیا ہے بلکہ قواعدِ تجوید میں خصوصی علامات جیسے علامت اخفاء، علامتِ اظہار، نون ساکن، نون غنہ، علامات ادغام بلاغنہ، علامت قلب، علامت مدطویل، علامت چلیپا، علامت ہمزہ وصل، علامت بیضہ کا یہی خیال رکھنا پڑتا ہے، میں اسی علم سے واقف نہیں مگر تجوید قرآن پر درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں، یا تو عربی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر یا بعض دوسرے وجوہ کی بنا پر جین صاحب اس کا کوئی ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ عورتوں کی زبان پر مرحومہ وحیدہ نسیم کا طویل مضمون خاصا دلچسپ ہے۔ اس مضمون سے

اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان کی تشکیل میں خواتین نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

آخر میں پانچ مضامین خود سید صاحب کے ہیں جن میں انھوں نے قومی زبان کی حیثیت سے اردو کی اہمیت، اس کی تدریس اور اردو پر انگریزی اثرات کا ذکر کیا ہے۔ گو اس کے بعض مضامین عوام کی فہم سے بالاتر ہیں، پر بھی کتاب قابلِ قدر ہے اور سید روح الامین صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے ایسے قیمتی مضامین یکجا کیے۔

چودھری افضل حق اور ان کی تصنیف ''زندگی''

سوانح اور فکری وفنی مطالعہ

ڈاکٹر اسلم انصاری

صفحات ۲۸۰ قیمت:/۲۷۵ روپے

ناشر: دارالکتاب، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

مبصر: وحیدالرحمٰن خان

چودھری افضل حق کی ''زندگی'' ایک زندہ، مستقل اور معتبر تصنیف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے ایک حد تک قبولِ عام کی سند بھی حاصل ہے اور قارئین کا ایک وسیع حلقہ بھی میسر ہے۔ لیکن زیادہ تر مخصوص ذوق اور مزاج کے حامل افراد ہی اس کی خوبیوں اور لطافتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ قارئین کی ایک محسوس تعداد اسے ایک ''ہلکا پتھر'' سمجھ کر نظرانداز کرتی آئی ہے۔ دراصل ''زندگی'' کے ضمن میں اردو تنقید بعض تحفظات کا شکار ہے اور اپنا فریضہ انجام دینے میں غفلت کا مظاہرہ کرتی آئی ہے۔ یہ تصنیف ایک مدت سے ایک ایسے فاضل، غیر جانب دار اور باشعور نقاد کی منتظر تھی جو اس کے محاسن اور مفاہیم کا معروضی انداز میں تجزیہ کرے، اس کی قدر و قیمت کا تعین کر سکے اور بھرپور طور پر اسے قارئین ادب سے متعارف کرا سکے۔ یہ فرضِ کفایہ ممتاز نقاد اور دانشور ڈاکٹر اسلم انصاری نے ادا کیا ہے۔ انھوں نے ''زندگی'' اور ''صاحبِ زندگی'' پر ایک نہایت عمدہ کتاب تحریر کی ہے۔ ''زندگی'' ایک اعتبار سے خوش قسمت کتاب بھی ہے کہ اسے ڈاکٹر اسلم انصاری جیسا بالغ نظر نقاد میسر آیا ہے جنھوں نے اردو، انگریزی اور فارسی ادبیات کا عمیق مطالعہ کیا ہے اور جو شاعری، نفسیات، فلسفہ اور فنونِ لطیفہ پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ انصاری صاحب کی اپنی شاعری اور تنقید تا حال کیسی ایسے ہی پختہ اور باکمال نقاد کے انتظار میں ہے۔ یہ انتظار شاید ہر سچے تخلیق کار کا مقدر ہے۔

جناب اسلم انصاری کی تصنیف ''چودھری افضل حق اور ان کی تصنیف ''زندگی''۔ سوانح اور فکری وفنی مطالعہ'' ایک جانب ''حق شناسی'' کا فریضہ انجام دیتی ہے اور دوسری طرف معاصر تنقید میں ایک ''زندگی بخش'' اضافہ بھی ہے۔ یہ تنقیدی کتاب سات ابواب پر

مشتمل ہے جن کی تفصیل یوں ہے:

۱۔ چودھری افضل حق۔ سوانحی خاکہ اور علمی و ادبی خدمات

۲۔ زندگی۔ ایک تمثیل

۳۔ عالم مثال اور عالم برزخ

۴۔ زندگی کا فلسفہ مذہب، فلسفہ اخلاق

۵۔ زندگی۔ فنی اور تکنیکی مطالعہ

۶۔ زندگی۔ اسلوبیاتی مطالعہ

۷۔ زندگی۔ ادبیاتِ عالم کے تناظر میں

''زندگی'' کی نئی تعبیر، معنویت اور قدر و قیمت جاننے کے لیے ڈاکٹر اسلم انصاری کی اس تصنیف کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔

ع: زندگانی'' کی حقیقت ''کوہکن'' کے دل سے پوچھ!

چودھری افضل حق کے ہاں ایک روشن اور واضح تصورِ اخلاق کا سراغ ملتا ہے مگر ان کی تحریر کا یہ رُخ زیادہ تر پردۂ اغماض میں رہا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے افضل حق کے فلسفۂ اخلاقیات کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا ہے اور اس پہلو پر فکر انگیز بحث کی ہے۔ وہ ''زندگی'' کے مابعد الطبیعیاتی پہلوؤں کی جانب بھی متوجہ ہوئے ہیں اور اس حوالے سے کئی اہم اور نادر نکتے سامنے لائے ہیں۔ انصاری صاحب نے صرف ''زندگی'' کے اسرار عیاں نہیں کیے بلکہ اساطیر کا مطالعہ اور اسلوب کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ یہ تمام اُمور انھوں نے نہایت متین، دلکش اور عالمانہ انداز میں انجام دیے ہیں۔ انھوں نے محض تصنیف کو اپنی تنقیدی و تحقیقی اُمنگوں کا مرکز نہیں بنایا بلکہ مصنف کی حیات اور اس کے دور کے سیاسی و سماجی حالات بھی سپردِ قلم کیے ہیں اور یوں ایک وسیع تناظر میں زندگی کی معنویت اور مفہوم کو اجاگر کیا ہے انھوں نے ''زندگی'' کو ''پیمانۂ امروز و فردا'' سے ناپا ہے، یعنی قدیم و جدید علمی تصورات کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا ہے اور اس ضمن میں مشرق و مغرب کی دانش سے فیضان حاصل کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ''زندگی'' کی مذہبی اور تمثیلی معنویت کو عمدگی سے بیان کیا ہے اور اس کی فنی، تکنیکی اور اسلوبیاتی محاسن کا بھی ماہرانہ تجزیہ کیا ہے۔ آخر میں انھوں نے اس کتاب کا ادبیاتِ عالم (رسالۃ الغفران، سیر العباد الی المعاد، فتوحات مکیہ، ڈیوائن کامیڈی اور جاوید نامہ) کے تناظر میں مطالعہ کرتے ہوئے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ: ''یہ کتاب ''عظیم'' نہ سہی ایک ''زندہ'' کتاب ضرور ہے اور یہی اس کی اہمیت کی بنیاد ہے۔''

جہاں تک ڈاکٹر اسلم انصاری کی زیرِ مطالعہ تصنیف کا معاملہ ہے تو اس کے بارے میں بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ اردو میں عملی اور تجزیاتی تنقید کی ایک نمائندہ اور بہترین کتاب ہے۔

میں اور تم

روبی جعفری

صفحات ۱۶۰ قیمت:/۱۵۰ روپے

بہزاد قمر پبلی کیشنز، چیچہ وطنی، پنجاب

مبصر: کیفی حسینی

''میں اور تم'' سے آپ دھوکہ نہ کھائیں۔ یہ نثری کتاب نہیں بلکہ روبی جعفری صاحبہ کا مجموعۂ کلام ہے۔ ''میں اور تم'' جدیدیت کے پہلو سے جنم لیتی ہوئی ایک ایسی کتب ہے جس میں ندرت بھی ہے، لفظی بازیگری بھی ہے مگر بقول حضرت میر:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

یا یوں سمجھئے بزبانِ غالب:

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

بقول روبی صاحبہ کے شاید خدا نے اس خللِ دماغ کے لیے ''مجھ خاص'' کو منتخب کیا؟ لیکن یہ دعویٰ میر نے بھی نہیں کیا ہے، لہٰذا یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ شاعری کے اسرار آپ پر منکشف ہونے لگے ہیں۔ بس مشقِ سخن جاری رکھیے۔

آپ کو پڑھ کر حیرت نہیں ہونا چاہیے کہ روبی صاحبہ نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام بہت سوچ سمجھ کر اور بڑی ریاضت کے بعد رکھا ہے اور کہ لکھنے کے ساتھ ساتھ نباہ بھی کیا ہے۔ دورِ جدید کا شاید یہی تقاضا بھی ہو۔ غزلوں میں کہیں کہیں ایک آدھ چنگاری دبی راکھ سے نکل پڑتی ہے۔ مثلاً:

منکشف ہوگئے جذبات بھی خوشبو کی طرح
میں تو خاموش تھی سانسوں نے شکایت کردی

سانسوں کی شکایت اردو غزل میں نیا استعارہ سمجھئے یا پھر یہ شعر ملاحظہ فرمایئے اور خصوصاً اس کے فکری پہلو پر غور کیجیے:

سرگوشیوں میں اس کی ہے امرت بھرا ہوا
لیکن حقیقتوں کے وہ منظر میں کچھ رہے

بہرحال میں نے جو محسوس کیا وہ ظاہر کردیا۔ اگر یہ داخلیت کے جزیرے سے باہر آجائیں اور غمِ جاناں کے بجائے غمِ دوراں کا خیال رکھیں تو ان کی نظموں میں بات بن جائے گی۔ روبی صاحبہ میں شاعری کی صلاحیت موجود ہے کیا ہی اچھا ہو اگر وہ کلاسیکی ادب اور خاص طور سے اساتذہ کرام (قدیم) کا گہرا مطالعہ کریں جس سے انھیں بہت فائدہ ہوگا۔

شکستہ دعائیں

ڈاکٹر نعیم قریشی

صفحات ۱۵۸ قیمت:/۱۵۰ روپے

ناشر: بابائے اردو فاؤنڈیشن پاکستان

مبصر: ڈاکٹر سید وسیم الدین

''شکستہ دعائیں'' ڈاکٹر نعیم قریشی کا باقاعدہ پہلا مجموعۂ کلام ہے جو ۱۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں معروف تبصرہ نگاروں میں ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، پروفیسر سحر انصاری، خواجہ رضی حیدر، خیال آفاقی، پروفیسر رئیس علوی، پروفیسر بدرالزماں بدر، پروفیسر علی حیدر ملک قابل ذکر ہیں۔ یہ کتاب بقول ڈاکٹر نعیم قریشی کے اُن کے ایک شاگرد ڈاکٹر کنور فاروق جوبش کی تحریک کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ڈاکٹر نعیم قریشی نے اظہار بیان کے لیے تمام اصناف سخن کو اپنایا ہے تاہم ان کے مزاج میں تغزل کا رنگ نمایاں ہے۔

پروفیسر سحر انصاری نے اپنے تاثرات میں رقم طراز ہیں کہ نعیم قریشی کے لب ولہجہ کا سلسلہ سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، خالد علیگ اور حبیب جالب سے ملتا ہے۔ وہ بھی انہی شاعروں کی طرح اپنی بات بلند آہنگ میں کہنے کے عادی ہیں۔

پروفیسر علی حیدر ملک نے ''شکستہ دعائیں'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ نعیم قریشی کے ہاں مطالعہ ومشاہدہ اور شعور وآگہی کے ساتھ شعر گوئی کی فطری صلاحیت موجود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب وہ شاعری اور اس کی اشاعت کی طرف سنجیدگی سے توجہ دیں۔

ڈاکٹر نعیم قریشی سے میری رفاقت گزشتہ بیس سال سے ہے۔ وہ میرے سنیئر رفیق کار ہیں۔ میں نے بھی اُنھیں متعدد بار اس بات پر اُکسایا کہ وہ صاحب دیوان شاعروں کی صف میں شامل ہوں۔ مقامِ رشک ہے کہ وہ صاحب دیوان شاعر ہوگئے ہیں اور اُنھیں اس کتاب کے توسط سے ادبی حلقوں میں مزید پذیرائی حاصل ہوگی۔ کیفیت کے لحاظ سے یہ مجموعۂ کلام شاعری میں ایک خوش آئندہ اضافہ ہے۔ کتاب ہذا میں حمد، نعت، غزلیات، قطعات، نظمیں، سہرا، منقبت سب ہی کچھ موجود ہے۔

جامعہ اردو میں ڈاکٹر نعیم قریشی بنیادی طور پر سیاسیات کے اُستاد ہیں۔ اب انھیں دائرہ ادب کے حلقے میں باقاعدہ شاعر شامل کرلیا گیا ہے جو اُن کے لیے ایک اعزاز بھی ہے اور اہل ادب کے لیے ایک نیا تجربہ بھی۔ ''شکستہ دعائیں'' کے چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے:

نعت:

نعت محبوب خدا کی ملے توفیق اگر
کالی کملی کا تصوّر لیے شب بھر لکھوں
پھر بھی سرکار کی توصیف ادھوری رہ جائے
میں اُنھیں نور کہوں نور کا پیکر لکھوں

غزلیات:

کھڑکیاں بند ہیں آہٹ بھی نہیں ہے کوئی
گھر کے باہر تو سنا ہے کہ بہار آئی ہے
شیخ حرم کی شوخی ٗ گفتار کے سبب
محفوظ ہے حرم نہ سلامت قبائیں ہیں
کتنے ہی وسوسے تھے مجھے راہِ عشق میں
کتنے گمان گذرے ہیں میرے لبھاؤ پر
مجھ کو کچھ دیر تلاطم کے مزے لینے دو
مجھ کو درکار نہیں ہے ابھی ساحل لوگو
شہروالوں کی پذیرائی کا شکوہ کیسا
صرف پتھر ہی ملا کرتے ہیں دیوانے کو
اے حسن بے حجاب تیری ہر ادا کی خبر
ہر سو مچا ہے شور کہ وہ فتنہ گر گیا
وہم وگمان میں گم ہیں خرد مند آج بھی
دیوانے تیری منزلِ عرفان میں آگئے

کتاب کا بیرونی منظر نامہ نظر کو بھاتا ہے لیکن حروف کے سجائے ہوئے اندرونی مناظر تو اس سے بھی زیادہ عمدہ اور دیدہ زیب ہیں۔

اللہ کرے زورِ سخن اور زیادہ۔

جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری

از

ڈاکٹر ناہید قاسمی

صفحات: ۷۸۰ قیمت: ۴۰۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

گردوپیش

انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام آنجہانی رالف رسل پر تعزیتی ریفرنس

۱۱/اکتوبر ۲۰۰۸ء بروز ہفتہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیر اہتمام برطانیہ میں اردو دوست رالف رسل کے انتقال پر ایک تعزیتی ریفرنس منعقد ہوا جس میں امراؤ طارق، محمود عزیز اور صدر انجمن جناب آفتاب احمد خان نے اپنی آرا کا اظہار کیا۔ ابتدا میں تقریب کے ناظم جناب امراؤ طارق نے رالف رسل کے پس منظر، ان کی اردو کے لیے خدمات اور ان کی کتابوں کا تذکرہ کیا جو انھوں نے تحریر کیں اور خاص طور پر بتایا کہ انھوں نے برطانیہ میں کیمبرج یونی ورسٹی کے مشرقی زبانوں کے فروغ کے پروگرام کے تحت انگریزوں کے لیے اردو کا نصاب تیار کیا تا کہ وہ آسانی سے اردو سیکھ سکیں۔

محمود عزیز صاحب نے بتایا کہ وہ اوائل عمری میں بائیں بازو کے نظریات کے حامل بن گئے تھے۔ جب وہ فوج میں بھرتی ہوئے تو انڈیا میں تعینات ہوئے اور یہاں انھوں نے اردو سیکھی اور پھر برطانیہ واپس پہنچ کر دوسرے لوگوں کو سکھائی۔ وہ اردو کے ایک معتبر عالم تھے۔ ان کی کتاب Persuit of Urdu Literature کا ترجمہ انجمن ترقی اردو نے ''اردو ادب کی جستجو'' کے عنوان سے چھاپ رکھا ہے۔

صدر انجمن جناب آفتاب احمد خان نے ان کی زرّیں خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ وہ اردو کے سچے عاشق تھے انھوں نے اردو کے بڑے شاعروں مثلاً غالب اور دیگر کو مغرب سے روشناس کرایا اور اسے بتایا کہ اردو ایک بڑی اور باصلاحیت زبان ہے۔ انھوں نے فارسی شاعری کا بھی ترجمہ کیا۔ آفتاب احمد خان نے مزید بتایا کہ جب وہ سیکرٹری مالیات تھے تو انھوں نے قومی بجٹ اردو میں پیش کی جانے کی روایت ڈالی اور آج بھی قومی بجٹ اردو میں پیش کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ پرامید ہیں کہ اردو اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنا مقام حاصل کر لے گی۔ انھوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ قومی اسمبلی اور سینٹ میں نوے فیصد تقاریر اردو میں ہوتی ہیں، آخر میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں آنجہانی کے اہلِ خانہ سے تعزیت کا اظہار کیا گیا اور انھیں صبر کی تلقین کی گئی۔

(رپورٹ: ادارہ)

شاہ لطیف یونی ورسٹی خیر پور میں اردو کانفرنس سے وزیر اعلیٰ سندھ جناب قائم علی شاہ کا خطاب

اردو سمیت تمام زبانوں کی ترقی کے لیے ملک بھر میں مزید تحقیقی ادارے قائم کرنے کی ضرورت ہے، زبان و تہذیب قوموں کی شناخت ہوتی ہے۔ یہ بات وزیر اعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ نے شاہ عبداللطیف یونی ورسٹی خیر پور میں دو روزہ بین الاقوامی اردو کانفرنس کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کی کانفرنسوں سے عوام میں شعور بیدار ہوگا اور زبانوں کی ترقی کے منصوبے کی سوچ پیدا ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ شاہ عبداللطیف یونی ورسٹی کے اردو شعبے نے خیر پور میں بین الاقوامی اردو کانفرنس بلا کر بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شاہ عبداللطیف یونی ورسٹی شہید ذوالفقار علی بھٹو کا تحفہ ہے۔ وہ اسے پاکستان کی مثالی یونی ورسٹی بنانے کی کوشش کریں گے تاکہ کراچی سمیت ملک بھر کے طلبہ جدید تعلیم کے حصول کے لیے خیر پور آئیں۔ انھوں نے کہا کہ ادیب و شاعر قوموں کی زبان ہوتے ہیں۔ وہ دہشت گردی کے خلاف قلم کے ذریعے جہاد کریں۔ انھوں نے کہا کہ دہشت گردی اور بدامنی پر گولی سے نہیں قلم سے قابو پایا جاسکتا ہے۔ معاشرہ تعلیم عام کرنے سے بہتر ہوگا اور حکومت اس حوالے سے منصوبے تیار کر رہی ہے۔ شاہ عبداللطیف یونی ورسٹی کی وائس چانسلر نیلوفر شیخ نے اردو کانفرنس میں اردو کے بجائے انگریزی میں تقریر کی۔ اس موقع پر انھوں نے گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد کا پیغام پڑھ کر سنایا۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

''کلیاتِ جمال'' کی تقریب رونمائی سے یوسف جمال کا خطاب

ممتاز دانشور، گورنر سندھ کے مشیر یوسف جمال نے کہا ہے کہ تخلیقی کام کرنے والے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ جمال احسانی بھی ان میں سے ہیں جو اپنے اشعار کے باعث دلوں میں زندہ رہیں گے۔ ہر چند کے ان کی جدائی کو ۱۰ سال بیت گئے، لیکن جدائی کا غم آج بھی تازہ ہے۔ یہ بات انھوں نے آرٹس کونسل کے زیر اہتمام جمال احسانی کے تین شعری مجموعہ پر مشتمل ''کلیات جمال'' کی تقریب رونمائی میں اپنے صدارتی خطبے میں کہی، جس کے مہمانِ خصوصی پروفیسر سحر انصاری تھے، دیگر مقررین میں آرٹس کونسل کے سیکرٹری احمد شاہ، خواجہ جعفر رضا اور مصور شاہد رسام شامل تھے۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

انجینئر ذاکر علی کو سرسید احمد خان انٹرنیشنل ایوارڈ برائے ادب دینے کا اعلان

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن آف پاکستان کے اعزازی جنرل سیکرٹری محمد ذاعلی خان کو سال ۲۰۰۸ء کا

سرسید احمد خان انٹرنیشنل ایوارڈ برائے لٹریچر دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ دینے کا فیصلہ گزشتہ روز علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی جیوری کے اجلاس میں کیا گیا جس کے ارکان میں اسکالرز، ماہرین تعلیم، سینئر سفارت کار اور حکومت کے اعلیٰ افسران شامل تھے۔ جیوری کے سربراہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر پی کے عبدالعزیز تھے۔ واضح ہے کہ محمد ذاکر علی خان علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سابق طلبہ میں واحد ادیب ہیں جنھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے حوالے سے دس کتابیں اور کئی سو مضامین تحریر کرنے کے علاوہ پاکستان میں علی گڑھ تحریک کے ضمن میں اہم ترین تعلیمی خدمات انجام دیں ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی بھارت کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر پی کے عبدالعزیز نے اس ایوارڈ کی اطلاع سرسید یونی ورسٹی آف انجینئرنگ کے چانسلر انجینئر ظلِ احمد نظامی کے نام اپنے ایک خط میں دی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایوارڈ انجینئر محمد ذاکر علی خاں کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ۱۷ اکتوبر کو سرسید ڈے پر منعقد ہونے والی تقریب میں بھارت کے سابق چیف جسٹس اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے چانسلر جسٹس اے ایم احمد پیش کریں گے۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

جدید نعت کردار سازی میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔ جاذب قریشی

ممتاز شاعر اور نقاد پروفیسر جاذب قریشی نے کہا ہے کہ جدید نعت کردار سازی میں بھی نمایاں کردار ادا رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے معروف ادبی اور ثقافتی تنظیم ''بزم سراج الادب'' کی جانب سے منعقدہ نعتیہ مشاعرہ کے موقع پر اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ نعت ذہن و ضمیر کی آواز ہونے کے ساتھ ساتھ پورے وجود کا اظہار بھی ہے ہمارے عہد میں نعت نگاری کے سرمائے میں جدید تر اسالیب کا بھرپور تجربہ شامل ہے جس نے نعتیہ شاعری کو باقاعدہ فن کی شکل دے دی ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ عہد کی نعتوں میں خود احتسابی اور اپنے آپ کو بہتر بنانے کی خواہش میں اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھنے کی عظیم روایت سامنے آئی ہے۔ نعت مذہبی عقیدت سے آگے بڑھ کر زندگی کے بہترین فکری اور عملی رجحانات کی علامت بنتی جارہی ہے، آج کی نعت ایک عظیم موضوع ہے جس میں حضور اکرمؐ کے حوالے سے زمین و آسمان کے سارے دائرے اور ان دائروں کے تمام رویے جدید نعت نگاروں میں شامل ہوتے جارہے ہیں۔ مہمان خصوصی ممتاز بزرگ شاعر فہیم ردولوی نے کہا کہ نعت لکھنا سعادت ہی نہیں عبادت بھی ہے جو لوگ ''کاروان نعتِ گویاں'' میں شامل ہیں ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ قبل ازیں سید سراج الدین سراج نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اختر سعیدی نے نظامت کے فرائض انجام دیے اس محفل میں جن شعرا نے دربار رسالتؐ میں گلہائے عقیدت پیش کیے ان میں صاحب صدر اور مہمان خصوصی کے علاوہ عارف منصور، اختر سعیدی، مفتی نواب نفیس قدسی، سلطان مسعود شیخ ندیم، سراج الدین سراج، سلمان صدیقی، رضی عظیم آبادی، سعد الدین سعد، سحر علی نزہت عباسی اور زاہد علی زاہد شامل ہیں۔ بعدازاں دعوت

افطار کا اہتمام کیا گیا۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

استاد جمال بخاری کی ۱۶ویں برسی کا پروگرام

سندھی ادبی سنگت پڈعیدن کے زیر اہتمام سندھ کے ممتاز شاعر استاد بخاری کی ۱۶ویں برسی منائی گئی۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے سجن سندھی، ساگر حنیف بڑدی، جبار پلھ، عبدالحق پلھ، محبوب گل اور رحیم کھوکھر نے کہا کہ استاد بخاری نے اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر راج کیا۔ ان کی شاعری میں جہاں محبت، پیار، امن، انسانیت، بھائی چارے کا درس ملتا ہے وہاں سندھ دھرتی کی مٹی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ استاد بخاری کی شاعری نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ قبل ازیں محفل موسیقی میں شاہ نواز سولنگی، زاہد جانوری، فاروق راجپر، تنویر عباسی منگی، نذیر اے ناجی، ندیم نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی)

ڈاکٹر معین نظامی کے نئے شعری مجموعے

شعبہ فارسی، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے چیئرمین اور حضرت سیّد علی ہجویریؒ چیئر کے صدر ڈاکٹر معین نظامی کے دو نئے شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ''استخارہ'' ان کی اردو غزلوں اور ''طلسمات'' نظموں کا مجموعہ ہے۔ دونوں کتابیں لاہور کے مشہور پبلشرز بک ہوم نے شائع کی ہیں۔ ڈاکٹر معین نظامی صاحبِ طرز شاعر، ادیب، مترجم اور محقق ہیں۔ ان کی ۳۳ اردو اور فارسی کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جن میں سے دو تحقیقی کتابیں ایرانی حکومت کی طرف سے ایوارڈ یافتہ بھی ہیں۔ اس سے پہلے معین نظامی کی غزلوں کا ایک مجموعہ ''نیند سے بوجھل آنکھیں'' اور نظموں کی ایک کتاب ''تجسیم'' بھی سامنے آچکی ہیں۔ ان کے کلام کے کچھ حصے انگریزی اور فارسی میں ترجمہ بھی ہو چکے ہیں۔ معین نظامی کی شاعری رومانویت، تصوّف، مذہبیات، اساطیر، تاریخی تلمیحات، جدید حسیّت اور عصری حوالوں سے عبارت ہے۔ ان کی غزلیں معاصر اردو غزل میں صوفیانہ روایت کا بہترین اظہار قرار پاتی ہیں۔ ''استخارہ'' میں ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری اور ڈاکٹر ضیاء الحسن کی آرا شامل ہیں اور ''طلسمات'' میں محمد اظہار الحق کی ایک طویل تحریر کے کچھ اقتباسات دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر معین نظامی کی نظموں کے تیسرے مجموعے ''معبد'' کی اشاعت بھی جلد متوقع ہے۔ ان کا فارسی مجموعۂ کلام بھی زیرِ ترتیب ہے۔ علمی و ادبی حلقوں نے ڈاکٹر معین نظامی کے نئے شعری مجموعوں کا خیر مقدم کیا ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق، حیات اور علمی خدمات

از

شہاب الدین ثاقب

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی مفصل حیات اور زبان و ادب کے سلسلے میں کی
جانے والی ادبی خدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

شہاب الدین ثاقب نے اس وقیع کام کو پوری تندہی سے سرانجام دیتے ہوئے بابائے اردو
کا نہ صرف مرقع پیش کیا ہے بلکہ اُن کی علمی و ادبی خدمات کو ایک جامع حیثیت میں بھی مرتب کیا ہے۔
بابائے اردو شناسی میں یہ کتاب اہلِ علم کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔

قیمت ۴۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

بیاضِ مراثی

اشاعت دوم

گیارہویں، بارہویں صدی ہجری کے مراثی کا مجموعہ

مرتب: افسر صدیقی امروہوی

صفحات: ۲۷۰ قیمت: ۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

Regd M. No. 270 Phone: 4811406

Monthly **QAUMI ZABAN** Karachi

انجمن کی مجوّزہ عمارت کا نقشہ

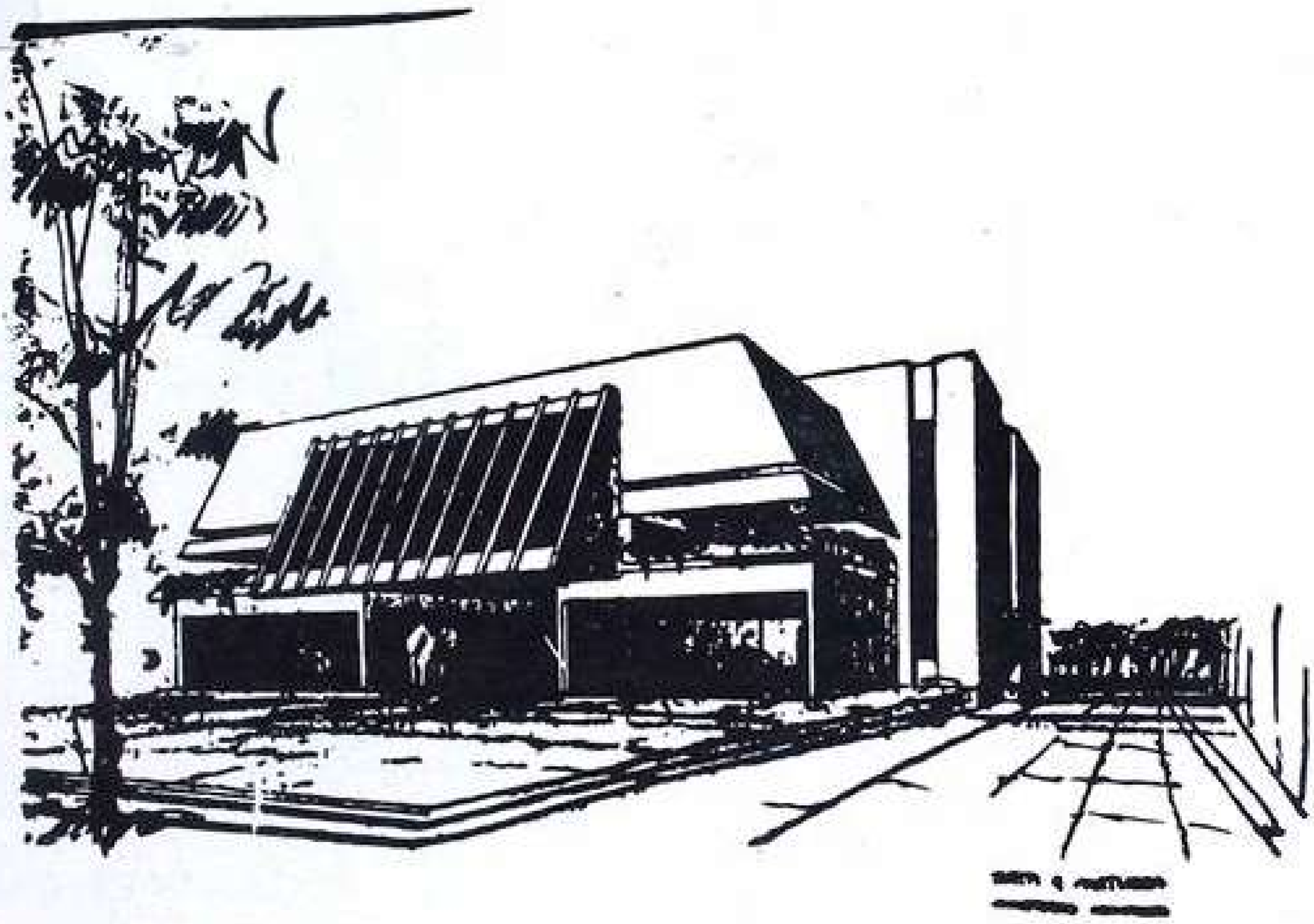

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

ڈاکٹر ممتاز احمد خان، مدیر قومی زبان، نے انجمن ترقی اردو پاکستان (ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی) کے لیے احمد برادرز، ناظم آباد، کراچی سے شائع کیا۔